(ص۲۱۵) اور اس کے ثبوت میں خود مولانا کی بھی ایک تحریر نقل کی ہے کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، جیسے صلب آزادی (ص۵۶) بجائے سلب دور متوسلین (ص۴۵) بجائے متوسطین، خالص معروضی مطالبہ (ص۱۸۱) بجائے مطالعہ، مالہ وما الیہ (ص۸) بجائے ماعلیہ، نامکمل سیاست (ص۲۰۳) بجائے سیاحت اور صحبۃ الاسلام امام محمد غزالی (ص۲۰۳) بجائے حجۃ الاسلام وغیرہ،

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت:۔	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت.	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" "
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
ایڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمن، عبد السلام قدوائی ندوی
قومیت	ہندوستانی،
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام وپتہ مالک رسالہ	" " "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں۔

سید اقبال احمد

جلد ۱۲۱ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۸ء عدد ۴

مضامین

شذرات

پاکستان کے قیام میں ایک علمی مجلس میں وہاں کے ایک بہت ہی ممتاز اہلِ علم نے سوال کیا کہ ہندوستان میں اس وقت اردو کی علمی و ادبی سرگرمیاں کیا کیا ہیں؟ میرا ایک جواب یہ بھی تھا کہ ہمارے یہاں کے نقادوں نے قدیم و جدید دور کے نثر نگاروں ادیبوں، شاعروں افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں پر اتنے چھوٹے بڑے مقالات لکھے ہیں کہ ان کے مطبوعہ مجموعے کئی الماریوں میں رکھے جا سکتے ہیں،

انھوں نے اس جواب کو سن کر کہا کہ مقالہ نگاری کوئی ٹھوس کام نہیں، اس قسم کا لٹریچر تفنن طبع کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے، مگر اس سے علم و ادب میں وزن اور وقار پیدا نہیں ہوتا، ان سے کہا گیا کہ ان نقادوں کی وجہ سے علمی و ادبی ذہن و شعور میں بڑی بیداری اور اضیا کا پیدا ہو گئی ہے، یہ سوال بھی اٹھا کہ اس وقت کے نقادوں نے آبِ حیات، مقدمۂ شعر و شاعری، اور شعر العجم جیسی کتابیں اردو ادب کو دی ہیں کہ نہیں، میرا جواب نفی میں تھا، اس کی وجہ یہ بتائی کہ آزاد، حالی، اور شبلی جیسے نابغانِ عصر ہر زمانہ میں نہیں پیدا ہوتے ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ اس دور کی تنقید نگاری میں ادب کے کنوئیں کی گہرائی نہ سہی، مگر دریا کا پھیلاؤ ضرور پیدا ہو رہا ہے،

اس علمی مجلس کی گفتگو تو وقتی تھی، مگر سوچنے کی بات ہے کہ آخر ہمارے زیادہ تر نقاد مقالہ نگاری پر کیوں اکتفا کر رہے ہیں، پھیلی ہوئی بات کو سمیٹ کر لکھنا بڑا ہنر ضرور ہے، ادبی شعور اور ضمیر کو مختصر لیکن واضح اور دلنشین طریقہ پر ادا کرنا بھی بڑا وصف ہے، قوتِ اخذ اور

غیر معمولی قدرتِ تحریر سے صفحوں کی باتیں چند سطروں میں لکھی جائیں، تو یہ اور بھی قابلِ تعریف ہے، جس طرح مختصر افسانہ نویسی ایک عظیم فن ہے، اسی طرح ایجاز کے ساتھ تنقید نگاری بھی کم عظیم فن نہیں،

مولانا محمد علی مرحوم اپنے اخبار ہمدرد میں بہت طویل اداریے لکھتے، جو کئی قسطوں میں ختم ہوتے، ان سے پوچھا گیا کہ وہ مختصر اداریے کیوں نہیں لکھتے، جواب دیا کہ مختصر تحریر لکھنے کے لئے ان کے پاس کافی وقت نہیں ہوتا، ان کا مطلب یہ تھا کہ مختصر تحریر لکھنے میں غور و فکر، محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے لئے کافی وقت چاہئے، اگر ہمارے مقالہ نگار اپنے مختصر مقالات واقعی فکری کاوش و مشقت سے لکھتے ہیں، تو یہ مقالہ نگاری کا روشن پہلو ہے،

مگر بعض نقادوں کی تنقید نگاری کے اختصار اور ایجاز میں غزل کی ایمائیت اور اشاریت پیدا ہو جاتی ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے ناظرین سے پوری توقع رکھتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کو وہ صحیح سمجھیں، ایسے نقاد اپنے دعوی کو دلائل سے ثابت کرنا ضروری نہیں سمجھتے، کچھ ایسے بھی ہیں، جن کو چونکا دینے والی بات لکھنے میں لذت ملتی ہے، وہ نئی یا انوکھی بات لکھنے میں یا تو صحیح بات کو قربان کر دینا، یا پھر اپنی طرف سے کوئی آرڈیننس یا مارشل لا جاری کرنا پسند کرتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جن کے تحریری فن کے نیچے ان کا تنقیدی آرٹ دب کر رہ جاتا ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جن کے یہاں ہاں اور نہیں دونوں کی آنکھ مچولی ہوتی ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے عقیدت مندانہ یا مبلغانہ جوش میں اپنے ذہنی رجحانات کے عروس کو اپنی رنگین تحریروں کا خلعت پہنا کر اس کو خوش کر لینے پر اکتفا کر لیتے ہیں،

اردو ادب میں ایسی تنقیدوں کی رنگا رنگی سے ادبی نشاط بھی پیدا ہو رہا ہے، مگر

اس کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کیا یہ صحیح معنوں میں باعثِ نشاط ہے، کیا یہ زیادہ تر تفریحی، جذباتی اور تاثراتی ہیں، یا واقعی تجزیاتی اور تحلیلی ہیں، ؟ کیا یہ تنقید نگاری کے اعلیٰ اور با مقصد اصولوں کے مطابق ہیں، ؟ کیا اُن سے ادبی نکتہ رسی، تنقیدی دیدہ وری، اور علمی بالغ نظری میں اضافہ ہو رہا ہے، ؟ یا یہ چھوٹے چھوٹے تنقیدی مقالے محض سہل انگاری کی نشاندہی کرتے ہیں، کچھ ایسے قابلِ قدر نقاد ہیں، جن کے مقالات کے تو بہت سے مجموعے شائع ہوتے، مگر وہ کسی کتاب کے مصنف نہیں ہو سکے آخر کیوں ؟ اس کا جواب ذرا سنبھل کر دینے کی ضرورت ہے،

اس ماہ کے معارف میں ڈاکٹر ظفر الدین اور جناب اعجاز صدیقی کی وفات پر ماتمی تحریریں شائع ہو رہی ہیں، ڈاکٹر ظفر الدین علامہ شبلیؒ کی پوتی کے شوہر تھے، ان کی وفات دار المصنفین کے لئے بھی غمناک حادثہ ہے، جناب اعجاز صدیقی کی رحلت سے دار المصنفین اپنے ایک بڑے قدر دان سے محروم ہو گیا، یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں، کہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کی وفات کی خبر ملی، انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی، نوّے سال کے تھے، وہ ایک جلیل القدر، مرنجاں مرنج، بامروت، وضعدار شخصیت، پارلیمانی دستور کے بڑے ماہر، ہندو مسلمان کی ملی جلی تہذیب کے عمدہ نمونہ اور اردو زبان کے بڑے محسن کی حیثیت سے برابر یاد کئے جائیں گے، وہ اپنی ترشی ہوئی بھلمناہت کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست کی جذباتی ہم آہنگی کے قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے ہیں، بشرطیکہ موجودہ قومی دھارے کے بنانے والے اُن کو ایسا ہی سمجھیں،

دار المصنفین کے معارف پریس کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے ایک ایسے کارگذار اور تجربہ کار پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت ہے جو لیتھو مشین کے کل پرزوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے ساتھ عمدہ اور رنگین طباعت کرانے کا ماہر بھی ہو، اس کے لئے دار المصنفین کے ناظم سے خط و کتابت کی جا سکتی ہے؛

مقالات

عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت
کے
مظاہر اور خصائص

سیرۃ النبی جلد ہفتم کے ایک باب کے کچھ اور حصّے
سلسلہ کے لئے دیکھئے معارف مارچ ۷۸ء

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

عمال و حکام در حقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں، اس لئے اُن پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہدِ نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمالِ نبوی کی شکایت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے اُن کو خاموش کر دیا ہو یا حکام کی حمایت میں معترض پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال سے فرمایا، "ہاں مظلوم کی بد دعا سے بچتے رہنا کہ اُن کی دعا اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی، اور اُن سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو"[1]

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۶۶ کتاب الزکاۃ باب ارضاء السعاۃ،

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسے معترض کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا، اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ اس کو عطا فرمایا،

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہو گئی آپ اس کی طرف پھرے، تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیونکہ جو لادو گے، وہ نہ تمہارا مال ہوگا، اور نہ تمہارے باپ کا حضورؐ نے تین بار فرمایا، نہیں، استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ نہیں استغفر اللہ، اس کے بعد فرمایا، میں اس وقت تک نہیں لادوں گا، جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے، اس کا بدلہ نہ دو مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے اونٹ پر جَو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں[1]،

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی صحابہ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا، اور کہا تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہم کلام ہے بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہئے کیونکہ اس کا حق ہے اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا[2]،

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپ نے ایک وستی چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب الحلم،

[2] ابن ماجہ باب لصاحب الحق سلطان

میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچائی کہ ہائے بدمعاملگی، لوگوں نے سمجھایا، کہ رسول اللہ صلعم بد معاملگی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں، اس کو چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ نے پھر فرمایا اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے، اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم و عفو اور حسنِ معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی، اور اچھی دی"[1]

بہرحال یہ تو مسلمانوں کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں، جو یہودیوں کی بیجا اور ابیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی،

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلعم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے، کہ تقاضے کو آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی، اور سخت و سست کہکر کہا کہ اے عبد المطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو" حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف منھ کر کے کہا، او خدا کے دشمن، تو رسولؐ اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا، عمر! مجھکو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہئے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہئے تھا، کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں۔ یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد فرمایا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۶۸

دیدہ یہودی حلم و عفو کے اس پر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔[1]

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا، اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا میں سمجھا، مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں، اور دام نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔[2]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا، آپ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا، اور معاملہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی، ذرا اسلام کے امیر کی اس حیثیت کو زمانہ کے سلاطین اور امراء کے اس غرور و تجبر سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر اُن کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے تھے، اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا تھا، بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ اُن کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ پہلے بھی تھی، اور اب بھی ہے، کہ ذات شاہی ہر مواخذہ سے بری اور ہر ذمہ داری سے برتر ہے، اس سے بھلا برا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت کی حد سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم

---

[1] یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے، (شرح شفا، از شہاب خفاجی)، [2] جامع ترمذی کتاب البیوع،

اور راعی و رعیت قانون کی دار و گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں،

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک معصوم پیغمبر تھے، جس کا ہر قول و فعل جائز حد سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمامتر مستحسن ہوتا تھا، اور آپ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کرکے واصل جہنم کر سکتی تھی، با ایں ہمہ آپ کے ذاتی کاروبار اور حاکمانہ اقتدار کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا سوا اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ یہ امراء اسلام کی تعلیم کے لئے عملی اسباق پیش فرمائے جاتے تھے، اور اس کے لئے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تاکہ آئندہ امت کے لئے بعد کے آنے والے امراء اور حکام اس استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو بند نہ کریں،

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے کبھی ذات شاہانہ پر اس درود سوال و جواب اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روما میں کسی زمانہ میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراء کی تھیں، اُن کا تعلق عوام سے نہ تھا، اور نہ اُن کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا، وہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع، یہ خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی یہ بلندی کا منظر نظر آیا، اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاص قلب، صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہونچے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا، اور وہ اس کے پجاری تھے، اور وہ اس دیوتا کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے، اور ان کا وطن حدود کی چہار دیواری میں محدود تھا جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے، اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز ناآشنا تھی، اس

حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے، بلکہ اس ذاتِ اقدس سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشم ادب کی سرمہ تھی، اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی، بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ،

اس کے بعد سلطنت و امارت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کرکے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں سب سے اعلیٰ اور برتر تھے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو، اس کو اپنے سے کم لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی، لیکن ایک تو اس لئے تاکہ مسلمانوں سے رائے لینے میں اُن کا دل بڑھے، اور دوسرے اس لئے کہ چونکہ آپ کے ہر فعل سے اسلام کی شریعت کا قانون بنتا ہے، اس لئے آپ کا یہ فعل پیچھے آنے والے خلفاء و امراء اسلام کے لئے مثال و نظیر کا کام دے، خود آپ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ :-

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران ع ۱۷) — یعنی اے رسول !! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے،

چنانچہ حضورؐ نے اس پر بنفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدح فرمائی اور انکی خصوصیت ظاہر کی کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ ع ۴) — یعنی ان مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں،

اور اگرچہ عہد نبوت میں سلطنت و حکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے، اور

نبوت کے عہد اقدس میں اس کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا ہے، اور اُن کی رائے پر عمل کیا ہے، اور اس کا منشاء صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید فیصلہ تک پہونچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی،

مدینہ پہنچکر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی، تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک ساتھ مسجد میں جمع کیا جائے، چنانچہ اس کے متعلق ہنوز وحی نہیں آئی تھی، اس لئے آنحضرت صلعم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا یہود و نصاریٰ کے یہاں اس موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا بعض لوگوں نے نماز کے وقت علم بلند کرنے کی رائے دی لیکن آپ نے ان میں سے کسی کو پسند نہیں کیا، حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیجکر نماز کا اعلان کرایا جائے آپ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا انہوں نے الصلاۃ جامعۃ کہکر پکارا اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی[1]، اور نیز تاثیر سے بعض دوسرے صحابہ نے بھی اسی قسم کے خواب دیکھے[2] اور آکر بیان کیا، چنانچہ آپ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا

---

[1] مصنف عبد الرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب المراسیل لابی داؤد، و فتح الباری ابن حجر و روض الانف سہیلی و زرقانی علی المواہب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان نووی میں ہے، فتشرع عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلک اما بوحی او باجتہادہ صلی اللہ علیہ وسلم علی مذہب الجمہور فی جواز الاجتہاد لہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیس ہو عملاً بمجرد المنام ہذا ما لا یشک فیہ بلا خلاف [2] ابوداؤد و ترمذی باب بدء الاذان

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدانِ جنگ کے قریب پہونچ کر آپؐ نے صحابہ سے مشورہ لیا کہ آیا دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں، باری باری سے ممتاز صحابہ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک انصاری رئیس نے اٹھکر کہا کہ یا رسول اللہؐ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہدیں کہ تم اور تمھارا رب جا کر میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑے، ہم تو یہیں رہینگے، خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے، اس کے بعد جب آپ میدانِ جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا۔ ایک تجربہ کار صحابی نے آکر جیسا کہ ابھی کہا گیا، عرض کی کہ یا رسول اللہؐ آپ حسب فرمانِ الٰہی اس مقام پر اپنے لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں، یا صرف حضورؐ کی یہ اپنی رائے ہے، ارشاد ہوا کہ یہ رائے ہے، اس پر انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ہم کو بدر کے اس مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہئے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے، حضرتؐ نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہیں جا کر قیام فرمایا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کئے گئے، تو آپؐنے تمام صحابہ سے مشورہ لیا کہ ان کے ساتھ کونسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا،[1]

اسی طرح احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے مشورہ چاہتا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں، یا شہر کے اندر رہ کر اور عبد اللہ بن ابی بن سلول منافق کا رائے دینا کہ شہر میں رہ کر گلی کوچوں میں مقابلہ کیا جائے۔ پھر پرجوش جان نثاروں کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہئے، اور حضور کا اپنی رائے کے خلاف اور انکی رائے

[1] ترمذی ص ۵۰۳ کتاب التفسیر سورۂ انفال،

کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا سامنا کرنا، امورِ حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے،

غزوۂ حنین میں جب قبیلۂ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا مال جو کچھ غنیمت میں آیا ہے، واپس کر دیا جائے، تو آپؐ نے فرمایا، کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا، ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپؐ نے بھی ان کی درخواست قبول کر لی، اگرچہ آنحضرتؐ کے حکم سے کسی کو سرتابی کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی تاہم آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمھارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ میں اُن کے قیدیوں کو واپس کر دوں، تم میں جس شخص کے دل میں آئے، وہ میری رائے پر عمل کرے، اور جو لوگ راضی نہ ہوں وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں جس وقت پہلا مالِ غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دیدیا جائے گا، تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اُٹھے کہ "یا رسول اللہؐ ہم اس پر راضی ہیں" آپؐ نے اُن کے اس مستعجلانہ اظہار کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہم کو شخصاً شخصاً یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ کون راضی ہے اور کون نہیں، اس لئے ہر شخص کو اپنا ایک ایک قائم مقام دعونیف ہمارے پاس بھیجنا چاہئے، چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو اُن کی رضامندی کی اطلاع دی،[1]

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہدِ مبارک میں انتظامی امور میں صحابہ سے مشورہ لیتے تھے، اور ان کے مشوروں پر اگر پسند فرماتے تو عمل بھی فرماتے تھے،

قیامِ سلطنت، اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد و صحیح بخاری کتاب المغازی،

سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنادیا، وہ انسانی شعبۂ حیات جس کے اصول میں تمام تر درندگی، بہیمیت، مکروفریب، دغل وسازش، ظلم وستم، اور جور وتعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اس کو اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ

السلطان ظل اللہ فی الارض	یعنی صاحبِ حکومت زمین میں اللہ کے
یاوی الیہ کل مظلوم من عباد	امن کا سایہ ہے،[1] جس کے دامن میں
اللہ۔	بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ السلطان العادل المتواضع ظل اللہ ورمحہ فی الارض، عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[2] "عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا"،

[1] و [2] یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیق ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں، بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفا ومزیل الالباس عطار حلبی لفظ سلطان، یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قدیم عربی میں السلطان بادشاہ کو نہیں، بلکہ طاقت وقوت کو کہتے تھے، جو انگریزی لفظ پاور کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مرادف ہے، اس لئے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظام حکومت مخلوقاتِ الٰہی کے آرام وآسایش کے لئے گویا زمین میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ عمال حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمایندہ ہیں، سلطان کا اطلاق ہوا ہے، جیسے حدیث میں ہے، السلطان ولی من لا ولی لہ یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہو، یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے یا اس کے

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں اسلام میں ان کو اپنے اس حسنِ عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا، جس طرح دوسرے عبادات کا،

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت کی وسعت میں داخل ہوگئی، اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدی وظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا، امیر معاویہ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کرلی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لئے ہوئے تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے، فوراً ان کی اس چال پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے، جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہئے، یہ سن کر وہ ہٹ گئے، (صحیح بخاری باب فضل من ترک الفواحش)

ہر سلطنت کو ٹیکس، مالگذاری اور خراج کے وصول کرنے کے لئے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہوجاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا، تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کے خدع وفریب، مکروحیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصیت وجمہوریت کو کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ دونوں قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری ونمائشی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) اس کا ہر جائز نمایندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی ہر ایک سلطان کہلائے گا، لیکن بادشاہ کے معنوں میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانہ سے بولا جانے لگا ہے،

تمدن و تہذیب میں اس قدر ترقی کرگیا ہے، تعلیم تمام ملک میں عام ہوگئی ہے، ہر فرد دنیویات سے واقف ہے، اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہوچکا ہے لیکن بایں ہمہ اگر سلطنت ذرا سی سہل انکاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصلِ سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا، مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہوکر اور کبھی عدالت کے مصارف میں ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کرکے جرم کے باداش سے بچنے کے لئے پوری کوشش کرتے ہیں باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت دوسرے ممالک کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے، اور سزا اس لئے نہیں دیجاتی کہ وہ ایک انتقامانہ چیز ہے، بلکہ اس کو اخلاقی صلاح کا ایک ذریعہ بنالیا گیا ہے لیکن بایںہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور بزدلی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے، اور یہ بھی جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کی جاتی ہے لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے، تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے اس قسم کے نظامِ سلطنت کا ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجبِ عذاب و ثواب سمجھتا ہے، اس لئے ان پر بلاجبر واکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہوسکتا ہے، اسلام کا نظامِ سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا، اور اسی بناپر وہ اس نتیجہ کا بہترین منظر ہے، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لئے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کے لئے مشکل تھی، چنانچہ کعب ابن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گرانباری کی بھی شکایت تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عہدِ مبارک میں عمال مقرر کردئے گئے تھے، تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سررشتہ،

اور باضابطہ نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کردی جاتی تو اس کو صدقہ و زکواۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں لیکن یہ اسلام کے نظامِ سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد، اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتا تھا، اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے،

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ کی خدمت
اذا اتاہ قوم بصدقتھم	میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر
قال اللھم صلِّ علی اٰل فلان	حاضر ہوتی تھی، تو آپ فرماتے تھے
فاتاہ ابی بصدقتہ فقال	کہ خداوندا فلاں کی آل پر رحمت
اللھم صل علی اٰل ابی اوفی	نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی
(بخاری کتاب الزکوٰۃ ص۲۰۲)	صدقہ لے کر آئے، تو آپ نے فرمایا
	کہ خداوندا! ابی اوفی کی آل پر رحمت بھیج،

حضرت عدی ابن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے، اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھ ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سردارانِ قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا لیکن جب وہ اسلام لائے، تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلہ کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انھوں نے اُن کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا

ان اوّل صدقۃ بیضت وجہ	پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرتؐ

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم — اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا،

ووجوہ اصحابہ صدقۃ طی — قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر

جئت بھا، (مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل) — آئے تھے،

قبیلہ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپنے فرمایا،

صدقات قومنا،[1] — یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے،

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جاکر بوجھ ڈھوتے تھے اور جو اس سے مزدوری ملتی تھی اُس کو لاکر صدقہ میں دیتے تھے،[2]

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئی کہ یہ تو انقلاب فطرت ہے لیکن اس درجہ کم ہوگئی کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھی، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے اُن کے مجرم ہوتے تھے، جرم کا نشہ ٹوٹنے کے بعد فوراً اُن کا نور ایمان چمک اٹھتا تھا، اور اس داغ کو دھونے کے لئے بیتاب ہوجاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہ نے بارگاہ نبوت میں آکر جس صداقت کے ساتھ اپنے بعض جرائم کا اعتراف کیا ہے، اس کی مثال خود دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے، اعتراف جرائم کے متعلق اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہئے کہ اسلام میں حکمت کے ساتھ جرائم کی سزائیں نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں، چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں یا کوڑے لگائے جاتے ہیں، یا سنگسار کیا جاتا ہے لیکن باایں ہمہ یہ مجرم خود حاضر ہوتے، اور ان سنگین سزاؤں کو سننے کے باوجود از خود اعتراف کرتے، اور سزا جاری کرنے

---

[1] مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل [2] صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ و کتاب الاجارہ باب من آجر نفسہ

کی درخواست کرتے۔

ماعز ابن مالک ایک صاحب تھے، انھوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب انھیں ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر از خود اس جرم کا اظہار کیا، اور عرض کی، یارسول اللہ مجھے پاک کیجئے، (صحیح مسلم باب الرجم) یارسول اللہ مجھ پر حد جاری فرمائی جائے آپنے اُن کی طرف سے منھ پھیر لیا، انھوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے، مجھ پر حد جاری فرمائیے، اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے رہے، اور آپ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپنے فرمایا کہ کیا تم اُس کے ساتھ ہم بستر ہوئے، انھوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی، انھوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا، انھوں نے کہا ہاں، ان تمام مراتب کے بعد آپ نے اُن کے سنگسار کرنے کا حکم دیا، جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا، بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر مارا، اور وہ وہیں ٹھنڈے ہوگئے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا، تو آپنے فرمایا ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتا، اور خدا اس کی توبہ کو قبول کر لیتا،[1] اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کے خود ذاتی اعتراف کی بناء پر سزا پارہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہے تو اس کے اس قرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کردی جائیگی، اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہوجائے گا،

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے، جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا لیکن انھوں نے از خود اپنے تیمار داروں سے اس کا اقرار کیا، اور ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر میری طرف سے عرض کرو اور فتوی پوچھو،

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۵ و صحیح بخاری کتاب الحدود،

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، حضور نے اُن کے لئے ان کی شدتِ علالت کے سبب ایک معمولی سزا تجویز کی[1]

کعب بن عمرؓ ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنھوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہم بستر نہیں ہوا تو یہ گنہگار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے[2]

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمتِ اقدس میں آئے، اور فیصلہ چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اٹھکر کہا کہ یا رسول اللہ ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ پھر بیٹھے ہی بدک جائے لیکن حضور نے دیت ہی پر زور دیا، یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا، کہ یا رسول اللہ مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے، میری مغفرت کے لئے دعا فرمائیے[3]

---

[1] ابوداؤد باب فی اقامۃ الحد علی المریض [2] ایضا باب یصیب الرجل دون الجماع وصحیح بخاری حدود،

[3] ابوداؤد کتاب الدیات

سلسلہ سیرۃ النبیؐ

حصہ	ضخامت	صفحے	قیمت
حصہ اول	ضخامت	۶۴۴ صفحے	۲۰-۰
حصہ دوم	"	۴۴۶ "	۱۴-۰
حصہ سوم	"	۸۸۸ "	۲۸-۰
حصہ چہارم	"	۹۰۲ "	۲۸-۰
حصہ پنجم	"	۵۱۵ "	۱۵-۰
حصہ ششم	"	۸۸۲ "	۲۸-۰

"منیجر"

حدیث کا تنقیدی مطالعہ[1]

از، مولانا محمد تقی امینی، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ،

تحقیق و تنقید کے لحاظ سے حدیث کے دو جزو ہیں، (۱) متن اور (۲) سند، متن اصل حدیث اور سند اس تک پہونچنے کے ذریعہ اور راستہ کو کہتے ہیں سند پر گفتگو کا تعلق خارجی نقد حدیث اور متن پر گفتگو کا تعلق داخلی نقد حدیث سے ہے، خارجی نقد میں راوی کے احوال کے لحاظ سے حدیث کی تحقیق و درجہ بندی ہوتی ہے، اور داخلی نقد میں الفاظ معانی اور مفہوم کے لحاظ سے حدیث کی تحقیق و محل کی تعیین ہوتی ہے،

حدیث کی صحیح معرفت کا طریقہ، حدیث کی صحیح معرفت اسی صورت میں ممکن ہے، جب کہ راوی (حدیث نقل کرنے والے) اور مروی (حدیث) دونوں سے متعلق پوری معلومات ہوں یعنی راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوا، اس کا حافظہ قوی تھا، یا کمزور نظر سطحی تھی یا گہری، فقیہ تھا یا غیر فقیہ، جاہل تھا یا عالم، اخلاق و کردار کیسے تھے، ذرائع معاش و مشاغل کیا تھے، روایت کرنے میں اس نے مقررہ شرطوں کا لحاظ کیا ہے یا نہیں؟ اسی طرح مروی کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کے الفاظ و جملوں میں کسی قسم کی خامی و کمزوری یا مقررہ قواعد کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جاتی ہے، معانی و مفہوم میں عقل، مشاہدہ، تجربہ، زمانہ کے طبعی تقاضہ، کسی مسلمہ اصول اور قرآنی تصریحات کی خلاف ورزی تو نہیں لازم آتی ہے،

---

[1] یہ مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سیمینار میں پڑھا گیا، جو ۸۰ء میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر منعقد کیا گیا تھا

جن سے کسی طرح بھی شانِ نبوت پر حرف آئے، یا فرمودات نبوی میں سطحیت ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو،

خارجی نقد پر تو کام لوگوں کے سامنے آچکا ہے، لیکن داخلی نقد پر جو کچھ کام ہوا وہ زیادہ لوگوں کے سامنے نہ آسکا اس لئے حدیث کے تنقیدی مطالعہ میں سردست اسی کو اہمیت دی جا رہی ہے۔

داخلی نقدِ حدیث کے اصول

داخلی نقد حدیث کے اصول یہ ہیں۔

(۱) رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں کسی قسم کی لفظی و معنوی رکاکت (سطحیت) پائی جائے، رکاکت کی دو قسمیں ہیں، (۱) لفظی و (۲) معنوی، لفظی رکاکت یہ ہے کہ الفاظ و جملوں میں فصاحت و بلاغت کے معیار اور قواعد عربیہ کی خلاف ورزی ہو کہ جس کو دیکھ کر عربی زبان کا ماہر جان لے کہ اس قسم کا کلام کسی فصیح اللسان کا نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ رسول اللہ ؐ کا کلام ہو (جو افصح ترین تھے)

معنوی رکاکت یہ ہے کہ معنی و مفہوم میں نادانی و کم عقلی کی بات پائی جائے جو شان نبوت سے فروتر ہو اور کلام معیار نبوت سے گر جائے،

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں خوبصورت چہرہ کی تعریف، ان کی طرف دیکھنے اور ان سے حاجت طلب کرنے کا حکم یا آگ کا عذاب ان کو نہ ہونے کی خبر ہو

(۳) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں مختلف پیشوں اور ان کے اختیار کرنے والوں کی برائی بیان کی گئی ہو،

(۴) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں خاندان، قوم یا شہر کی برائی ہو،

(۵) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں بے ڈھنگی اور اوٹ پٹانگ باتیں پائی جائیں

جو رسول اللہ ؐ کی شان سے بعید ہوں،

(۶) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں لغویت، تمسخر اور کم عقلی و بے وقوفی کی بات پائی جائے جس سے ذمہ دار لوگ پرہیز کرتے ہیں۔

(۷) آپؐ کی پیدائش کے واقعہ کی تشریح اس انداز سے ہو کہ نبوت پر حرف آئے اور معیار نبوت برقرار نہ رہے،

(۸) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں کلام انبیاء کے مشابہ نہ ہو چہ جائے کہ آپؐ کا کلام جس کو مختلف وجوہ سے فوقیت حاصل ہے،

(۹) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں ایسا کھلا بطلان ہو جو خود دلالت کرتا ہو کہ یہ اللہ کے رسول کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) آپؐ کی طرف منسوب حدیث محسوس عام مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہو،

(۱۱) آپؐ کی طرف منسوب حدیث عقل عام کے خلاف ہو یعنی فرد واحد یا کسی طبقہ کی عقل کے خلاف نہیں بلکہ عام طور پر لوگ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں

(۱۲) آپؐ کی طرف منسوب حدیث شہوت و فساد کی رغبت دلاتی ہو

(۱۳) آپؐ کی طرف منسوب حدیث حکمت و اخلاق کے عام اصول کے خلاف ہو،

(۱۴) آپؐ کی طرف منسوب حدیث قواعد طب (جس پر اتفاق کیا گیا ہو) کے خلاف ہو،

(۱۵) آپؐ کی طرف منسوب حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہو،

(۱۶) آپؐ کی طرف منسوب حدیث کے خلاف صحیح شواہد ایسے موجود ہوں جن سے اس کا باطل ہونا ظاہر ہوتا ہو۔

(۱۷) آپؐ کی طرف منسوب حدیث اللہ تعالیٰ کی تنزیہ و کمال کے خلاف ہو۔

(۱۸) آپؐ کی طرف منسوب حدیث صداقت قرآن کے خلاف ہو۔

(۱۹) آپؐ کی طرف منسوب حدیث سنت صریحہ کو کھلم کھلا توڑنے والی ہو۔

(۲۰) آپؐ کی طرف منسوب حدیث ان تمام قواعد کے خلاف ہو جو قرآن و سنت سے مستنبط کئے گئے ہیں۔

(۲۱) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں آئندہ واقعات کی ایسی پیشین گوئی ہو جو مہینہ اور سال کے تعین کے ساتھ ہو۔

(۲۲) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں چھوٹے کام پر بھاری ثواب کی بشارت ہو۔

(۲۳) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں چھوٹی بات پر سخت وعید کا مبالغہ ہو۔

(۲۴) آپؐ کی حدیث روایت کرنے میں کوئی مفاد گروہی عصبیت دین و مسلک کے اختلاف کو دخل ہو ان اصولوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم نے حدیثوں کے جانچنے کے لیے کسقدر بلند معیار قائم کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی محدثین نے کچھ کلی قواعد ذکر کیے ہیں، جن میں ابواب کے تحت روایتوں کو موضوع قرار دیا گیا ہے۔ طوالت کے خیال سے ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔[۵]

[۵] ابو الحسن علی بن محمد کنانی، حوالہ جات اور مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعہ ابو حفص عمر بن بدر الموصلی المغنی عن الحفظ والکتاب مقدمہ، طاہر بن صالح بن احمد جزائری توجیہ النظر الی اصول الاثر ملا علی قاری، موضوعات کبیر فصل ونحن ننبہ علی امور کلیۃ، مولانا عبد الحی لکھنوی ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی، الموضوع شاہ عبد العزیز عجالہ نافعہ، خاتمہ شمس الدین محمد سخاوی، فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث الموضوع، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، علامات الوضع فی المتن ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۳ ج ومن امارات الحدیث الخ محمد بن طاہر پٹنی تذکرۃ الموضوعات باب البقول وباب الحبوب وصنوف الحیوان علیہ الخ (بقیہ حاشیہ ص ۲۶۵)

داخلی نقد یعنی حدیث کو جانچنے کے ان مستقل اصول | خارجی نقد کے اصول بھی داخلی میں شامل ہیں

و قواعد کے علاوہ سند کو جانچنے (خارجی نقد) کے جو اصول مقرر ہیں ان کا تعلق بھی داخلی نقد سے ہے، بعض اصول داخلی نقد حدیث کے لیے خاص ہیں۔ مثلاً

مرفوع: وہ حدیث جس کی سند کی انتہا رسول اللہؐ تک پہونچے،

موقوف: وہ حدیث جس کی سند کی انتہا صحابی تک پہونچے۔

مقطوع: وہ حدیث جس کی سند کی انتہا تابعی تک پہونچے۔

مختلف الحدیث: وہ حدیث جس کی دوسری حدیث معارض ہو اور کسی دشواری کے بغیر دونوں کے مفہوم کو جمع کرنا ممکن ہو،

ناسخ و منسوخ: .... وہ دو حدیثیں جن کو جمع کرنا ممکن نہ ہو ایسی صورت میں دونوں کی تاریخ کے لحاظ سے ایک مقدم اور دوسری موخر ہو پہلی منسوخ اور دوسری ناسخ ہوگی، ایسی صورت میں دونوں کا موقع و محل متعین کیا جائے گا۔

بعض اصول داخلی و خارجی نقد دونوں میں مشترک ہیں، مثلاً حدیث کی پہلی تقسیم

صحیح۔ وہ حدیث جو ذمہ دار (عادل) اور قوی حافظہ والے شخص سے روایت ہو اور

(بقیہ حاشیہ ص) ابو غدہ تعلیق المنار المنیف، العجلونی، کشف الخفاء ج ۱ ص ۱۰۷، ابن جوزی، العلل المتناہیۃ (مخطوطہ) محمد بن عبد الرحمن سخاوی المقاصد الحسنہ جلال الدین سیوطی، اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعہ، محمد بن شوکانی الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعہ، محمد بن عبد الباقی الزرقانی شرح المواہب اللدنیہ، ابن تیمیہ، کتاب التوسل، عبد الحی لکھنوی، الآثار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ، ابن جوزی: کتاب الموضوعات، ابن عراقی، الموضوعات (مخطوطہ)،

معلل و شاذ نہ ہو۔

حسن۔ وہ حدیث جس میں اگرچہ "صحیح" کی شرطیں پائی جائیں لیکن اس کے بلند معیار سے کسی درجہ فروتر ہوں،

ضعیف وہ حدیث جس میں صحیح کی کل یا بعض شرطیں نہ پائی جائیں۔

حدیث صحیح کی شرط یہ ہے کہ وہ شاذ اور معلل نہ ہو۔

شاذ۔ وہ حدیث ہے، جس کے الفاظ کی زیادتی یا کمی میں ثقہ راوی ثقہ جماعت کی مخالفت کرے، اور دونوں کے درمیان جمع ممکن نہ ہو۔ یہ مخالفت کبھی سند اور کبھی متن میں ہوتی ہے،

معلل۔ وہ حدیث جس میں کسی علت کی وجہ سے اس کی صحت مجروح ہو جائے حالانکہ ظاہر میں کوئی خرابی نہ معلوم ہو، علت سے مراد وہ خفی اور باریک اسباب ہیں جو حدیث کو دوسری میں شامل کر دیں، یا اس کے مثل جو بھی تبدیلی حدیث کی صحت کو مجروح کر دے وہ علت میں داخل ہو گی، علت سند اور متن دونوں میں پائی جاتی ہے۔

منکر۔ وہ حدیث جس کا راوی تنہا ہو، اور اس شخص کے علاوہ نہ اس طریق سے اور نہ دوسرے طریق سے حدیث کے متن کا پتہ چل سکے۔

مضطرب۔ وہ حدیث جس میں روایت کے الفاظ مختلف ہوں کوئی راوی کسی طرح روایت کرے اور کوئی اس کے مخالف طریقہ سے روایت کرے۔

مصحف۔ وہ حدیث جس میں لفظ یا معنی کو بدل دیا جائے سننے کی غلطی سے ہو یا دیکھنے کی غلطی سے ہو۔

مقلوب۔ وہ حدیث جس میں کسی راوی سے متن میں کوئی لفظ الٹ جائے یا سند میں کسی راوی کا نام الٹ جائے یعنی جس کو مقدم ہونا چاہئے وہ مؤخر ہو جائے، اور جس کو

مؤخر ہونا چاہئے، وہ مقدم ہو جائے یا کسی نام و لفظ کی جگہ کوئی دوسرا نام و لفظ رکھ دیا جائے،

مدرج۔ وہ حدیث جس کے متن یا سند میں ایسی زیادتی کا پتہ چلے جو اس کا جز نہیں ہے۱؎

درایت کی عام و خاص تعریف

خارجی نقد کے اور بھی بعض اصول ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں، جن کی بنا پر محدثین نے درایت کی ایسی تعریف بھی کی ہے جو دونوں پر صادق آتی ہو، مثلاً۔ "درایت حدیث وہ علم ہے، جس سے راوی کی شرطیں، روایت کی قسمیں اور اس کے احکام کی معرفت ہوتی ہے، نیز مرویات کی قسمیں اور ان کے معانی کا استخراج ہوتا ہے، یہ درایت کی عام تعریف ہے خاص تعریف یہ ہے،

درایت حدیث وہ علم ہے، جس میں الفاظ حدیث سے سمجھے گئے مفہوم و مراد کی بحث ہوتی ہے کہ وہ عربی قواعد و شرعی ضوابط پر مبنی اور رسول اللہؐ کے احوال کے مطابق ہوں۲؎

اکثر و بیشتر داخلی و خارجی نقد میں ٹکراؤ نہیں ہوتا،

خارجی و داخلی نقد کے اکثر و بیشتر اصولوں میں اشتراک کی وجہ سے بالعموم خارجی و داخلی نقد میں ٹکراؤ نہیں ہوتا، بلکہ خارجی نقد (سند) کے لحاظ سے جو حدیث صحیح ہوتی وہ داخلی (متن) کے لحاظ سے بھی صحیح ہوتی ہے، اس کے باوجود سند و متن کی

۱؎ ابن حجر عسقلانی، نزہۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر، ابن صلاح، مقدمہ ابن صلاح شیخ عبد العزیز خولی تاریخ فنون الحدیث التنقید و الایضاح معرفۃ المنکر۔ محمد بن علی فارسی جواہر الاصول حسن محمد المشاط رفع الاستار ڈاکٹر صبحی صالح، علوم الحدیث و مصطلحہ۔ ۲؎ طاہر بن صالح، توجیہ النظر الی اصول الاثر، ارشاد المقاصد لذ مقدمہ تحفۃ الاحوذی (عبد الرحمٰن مبارکپوری) جلال الدین سیوطی، تدریب الراوی، نور الدین عتر المدخل، مقدمہ لابن الصلاح، زین الدین بن علی، شرح البدایہ فی علم الدرایہ (مخطوطہ) طاش کبری زادہ مفتاح السعادۃ حاجی خلیفہ، کشف الظنون نواب صدیق حسن خان، ابجد العلوم۔

صحت کے درمیان تلازم نہیں ہے، یعنی جب ایک صحیح ہو تو لازمی طور سے دوسرا بھی صحیح ہو
یا ایک حسن ضعیف ہو تو لازمی طور سے دوسرا بھی حسن وضعیف ہو، چنانچہ محدثین جب سند کی
صحت وغیرہ کا حکم لگاتے ہیں تو وہ متن کے لئے لازم نہیں ہوتا، اسی طرح جب متن کے بارے
میں کوئی حکم لگاتے ہیں تو وہ سند کے لئے لازم نہیں ہوتا۔

داخلی وخارجی میں ٹکراؤ کی شکلیں

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خارجی نقد (سند) کے لحاظ سے حدیث صحیح
ہوتی ہے، لیکن داخلی نقد کے لحاظ سے پایۂ اعتبار سے ساقط ہوتی ہے، اس کی عموماً دو شکلیں ہیں
(الف) بعض بددین اور جھوٹے راوی کسی موضوع حدیث کو ثقہ راویوں کی
حدیث میں داخل کر دیتے ہیں، پھر یہ داخل شدہ حدیث ثقہ راوی کی حدیث سمجھ کر روایت
کی جاتی ہے، مثلاً ابن ابی العوجاء جو حماد بن سلمہ کا ربیب (سوتیلا لڑکا) تھا، وہ ثقہ
راویوں کی حدیث میں یہ حرکت کیا کرتا تھا،

(ب) کوئی راوی جھوٹے اور ضعیف لوگوں سے حدیث سنتا جس کو یہ لوگ
اپنے شیخ سے روایت کرتے تھے، لیکن روایت حدیث میں حرص کی وجہ سے یہ راوی
درمیان سے جھوٹے اور ضعیف لوگوں کے نام نکال کر براہ راست شیخ سے روایت
کرنے لگتا تھا، جس سے حدیث مقلوب ہو جاتی تھی مثلاً بقیہ بن ولید کے شاگرد ایسا کر کے
اس کی حدیثیں بگاڑ دیتے تھے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ داخلی نقد کے لحاظ سے حدیث صحیح ہوتی ہے، لیکن خارجی کے لحاظ
سے وہ اس درجہ کی نہیں ہوتی اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ متن حدیث دوسرے طریق سے بھی
مروی ہو، جس میں اس طریق والی خرابی نہ پائی جائے۔

داخلی وخارجی نقد کے ٹکراؤ کی دوسری صورت کا پہچاننا زیادہ مشکل نہیں ہے البتہ

پہلی صورت کی پہچان زیادہ مشکل ہے، جس کے لیے فنی ذوق کے بغیر چارہ نہیں ہے، یہ فنی ذوق
رسول اللہ ﷺ کے الفاظ کی بکثرت ممارست سے پیدا ہوتا ہے یہ ایک خاص قسم کی نفسی کیفیت
اور مضبوط ملکہ ہے جس کے ذریعہ نبوت کے الفاظ کی پہچان ہوتی ہے، کہ وہ کیا ہیں۔ اور
کیا نہیں، ؟[1]

ٹکراؤ کے دفعیہ کے لیے کتب حدیث کی تقسیم

سہولیت کے لیے خارجی و داخلی نقد حدیث کے ٹکراؤ کو دو
حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے،

۱۔ غیر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ۔
۲۔ مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ۔

اگر غیر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ ہے تو پہلے مستند کتب کی طرف رجوع
کیا جائے گا، اور ان میں نظیر موجود ہے تو روایت کی حیثیت متعین کرنے میں زیادہ دشواری
نہ ہوگی اور اگر کوئی نظیر نہیں ہے تو بالعموم خارجی نقد کے ذریعہ حدیث کی تحقیق ہو جائے گی،
اور اگر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ ہے اور خارجی نقد کے لحاظ سے
وہ صحیح ہے تو پہلے کلام نبوت کی حیثیت سے اس کا محل متعین کرنے کی کوشش کی
جائے گی، اگر اس سے ٹکراؤ دور نہ ہوا تو پھر داخلی نقد کی بنیاد بنا کر اس کے صحیح وغیر
صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا،

شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک محدثین کی معتمد علیہ اور ان کی توجہات کا مرکز حدیث کی

---

[1] حسن بن محمد مشاط، رفع الاستار، ابن جوزی کتاب الموضوعات۔ ڈاکٹر صبحی الصالح
علوم الحدیث ومصطلحہ، سخاوی، المقاصد الحسنہ، محمد جمال الدین قاسمی قواعد التحدیث من فنون
مصطلح الحدیث، محمد صباغ مقدمہ الاسرار المرفوعہ وموضوعات کبیر کا اصل نام امیر یمانی توضیح الافکار

یہ کتابیں ہیں۔

موطا، بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، مسند احمد، نسائی،

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحیح حدیثیں صرف ان ہی کتابوں میں ہیں ان کے علاوہ اور کہیں ان کا وجود نہیں ہے، امیر یمانی کی کتاب "توضیح الافکار تنقیح الانظار فی اصول الحدیث" میں ایک مستقل باب "عدم انحصار الصحیح فی کتب الحدیث" کے نام سے ہے، جس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے، شاہ ولی اللہ نے بھی بقیہ کتابوں کی حدیثوں کو غیر صحیح نہیں قرار دیا ہے، بلکہ ان کی تحقیق کا کام ماہرین حدیث کے سپرد کیا ہے،

نقد حدیث میں جس طرح خارجی کی اہمیت ہے اسی طرح داخلی کی بھی ہے، اس اہمیت کے باوجود ہر موقع پر صرف خارجی نقد کو بنیاد بنانا اور بات نباہنے کے لیے حدیث کی ناقابل قبول تاویل سے بھی دریغ نہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے، "جواہرات" کے ڈھیر میں اگر چند خزف ریزوں کی آمیزش ہو تو ڈھیر کی عظمت اس میں ہے کہ ان کو خزف ریزہ تسلیم کیا جائے نہ کہ دور از کار تاویل کے ذریعہ ان کو جواہرات ثابت کیا جائے، اس سے خزف ریزے تو جواہرات میں نہ تبدیل ہو سکیں گے البتہ ان کی وجہ سے جواہرات کی قدر قیمت یقیناً گھٹ جائے گی۔[1]

داخلی نقد کے سلسلہ میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ حدیث کا ماخذ (سرچشمہ) شعور نبوت ہے اس کو جو خصوصیات حاصل ہیں وہ کسی اور کے شعور کو حاصل نہیں ہیں

[1] شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ باب طبقۃ کتب الحدیث محمد بن وزیر یمانی: الروض الباسم فی الذب عن سنۃ، قاضی حسن بن عبد الرحمٰن الرامہرمزی المحدث الفاصل بین الراوی والواعی ابن جوزی کتاب الموضوعات،

لازمی طور سے شعور نبوت سے نکلی ہوئی بات (حدیث) عام لوگوں سے ممتاز اور اس کی نقد و تحقیق کا پیمانہ دوسروں کے پیمانہ سے مختلف ہوگا، ورنہ نبی اور غیر نبی کے کلام میں فرق و امتیاز نہ قائم رہ سکے گا۔[1]

افراط و تفریط کے دو گروہ بد قسمتی سے حدیث کے نقدین میں بھی افراط و تفریط کے دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں، جنھوں نے نبوت کی قدر و منزلت نہیں پہچانی۔

(۱) ایک گروہ نے کلام نبوت (حدیث) کو جانچنے کے لیے اسی پیمانہ سے کام لیا جو عام لوگوں کے کلام کو جانچنے کیلئے مقرر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ہر ایسی حدیث سے انکار کر دیا، جس میں کوئی علمی حقیقت بیان ہوئی تھی، اور رسول اللہ کے زمانہ میں وہ مشہور نہ تھی، یا کوئی خوشخبری سے متعلق تھی، جس کا ابھی وقت نہ آیا تھا، یا قانونی کلیہ و حکمت کا اصول بیان ہوا تھا، جو اس وقت کی ذہنی سطح سے بلند تھا، اگرچہ بعد میں اس کا رواج ہو گیا، حالانکہ رسول اللہؐ صاحب وحی تھے، اسرار غیب سے بھی ایک حد تک واقف تھے، علم و حکمت کی ترویج اور قانون و شریعت کا نفاذ آپ کا خاص شان تھا، اس لیے آپ نے اگر کوئی بات وقت کی ذہنی سطح سے بلند کہی یا قانون و اصول اس انداز سے بیان کئے کہ بعد میں فلسفہ یا قانونی کلیہ کے مشابہ قرار پائے تو نہ شان نبوت پر حرف آتا ہے، اور نہ کسی مقنن و فلسفی سے متاثر ہونے کا سوال اٹھتا ہے۔

(۲) دوسرے گروہ نے رسول اللہ کی طرف منسوب جو بات بھی دیکھی، اسکو حدیث قرار دینے میں دین و مذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھ لیا، خواہ اس کی خاطر کتنی ہی

[1] القرآن، ابن تیمیہ، شرح العقیدۃ الاصفہانیہ، ابن خلدون مقدمہ ابن خلدون، غزالی، المنقذ من الضلال، القول فی خواص النبوۃ، الشیخ احمد سرہندی، مکتوبات مجدد - جلد سوم

دور دراز تاویل کرنی پڑے اور معیار نبوت گر کر کہیں سے کہیں پہونچ جائے،

عدل و اعتدال کی راہ عدل و اعتدال کی راہ یہ ہے کہ مقام نبوت تسلیم کرنے کے بعد حدیثون کے پرکھنے کے اصول وضوابط پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے، اگر اس کے بعد بھی حدیث کی معرفت میں واقعی دشواری قائم رہے تو فقہ کی طرح حدیث کی معرفت میں بھی اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ماہرین حدیث کو مزید اصول وضوابط وضع کرنے اور ان کے ذریعہ حدیث کی معرفت حاصل کرنے کا حق ہے،

ابتک اس سلسلہ کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی گئی، یا اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، مصر کے مشہور مصنف احمد امین نے چند اصول وضع کئے ہیں، جن کے بارے مین مصنف کا دعویٰ ہے کہ ماہرین حدیث نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی لیکن غور سے دیکھنے اور مذکورہ اصولون سے مقابلہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے، کہ یہ محض "احمد امین" کا دعوی ہے، نئے اصول کے نام سے جو انھون نے بیان کئے ہیں، وہ سب مذکورہ اصولون میں داخل ہیں،

غرض مقام نبوت تسلیم کرنے کے بعد حدیث کی معرفت کے لیے جس نئے اصول کی بھی ضرورت ہو، اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہئے اسی طرح جن حدیثون پر گفتگو ہو چکی ہے، ان پر اگر مزید گفتگو کی ضرورت سمجھی جائے تو اس سے انکار نہ ہونا چاہئے، اہل علم کی مساعی انتہائی قابل قدر ہونے کے باوجود نہ آخری ہیں، اور نہ بذریعہ وحی ان کی تصدیق ہوئی ہے، البتہ حدیث کی معرفت اور اس کے لئے نئے اصول وضع کرنے کا کام (بالفرض) اگر ضرورت محسوس ہو، ماہرین کے سپرد ہونا چاہئے، جو حدیث کے نوک پلک سے واقف ہون اور

اس سلسلہ میں غیر ماہر فن کی بات قابل اعتبار نہ ہو سکے گی، جیسا کہ اور علوم و فنون میں غیر ماہر فن کی بات قابل اعتبار نہیں ہوتی ہے۔[1]

درون خانۂ خود ہر گدا شہنشاہ است

قدم برون منہ از حد خویش سلطان باش

---

[1] ابن جوزی، کتاب الموضوعات، ڈاکٹر صبحی صالح، علوم الحدیث ومصطلحہ احمد امین: فجر الاسلام الفصل الثانی وضحی الاسلام الفصل الرابع۔

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

محدثین کرام کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف شروع ہی سے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر تھی، لیکن یہ کام مولنا شاہ معین الدین احمد ندوی کے دور نظامت مین انجام پایا۔ جس کے کئی حصے ہیں۔

حصہ اوّل مین امام مالک اور ائمہ صحاح کے علاوہ جن کی صحاح درس میں داخل اور تمام عربی مدارس میں متداول ہیں، دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح، فن حدیث سے متعلق ان کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں اور ماخذوں کے ذریعہ بہت ہی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے،

حصہ دوم۔ چوتھی صدی کے آخر سے آٹھوین صدی ہجری تک کے اکثر مشہور صاحب تصنیف محدثین اور اصحاب حدیث کے حالات، محدثین اور اصحاب حدیث کے حالات، حدیثی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہے

حصہ اوّل۔ قیمت ۵، ــ ۱۳ حصہ دوم قیمت۔ ــ ۱۶ مولفہ۔ ضیاء الدین اصلاحی

"منیجر"

نعت قدسی اور اس کا مصنف

از ڈاکٹر سمیع الدین احمد ریڈر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۳)

میرے معروضات کی تردید میں گپتا صاحب کا اگلا بیان (ص ۳۰۰ پر) یہ ہے:

"تحسین کے خمسہائے غزل قدسی کے سرورق پر قطعہ تاریخ طبع سے پہلے یہ الفاظ ہیں:۔

"تاریخ طبع خمسہائے غزل قدسی فخر شعرا"

طباعت کا آغاز ۱۲۶۹ھ میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں فارسی کا شباب ابھی باقی تھا، غالب، مومن، صہبائی، آزردہ سب حیات تھے، کیا اسوقت یا اس سے سو پچاس سال پہلے کا کوئی ایسا عظیم دہلوی شاعر جس کا نام محمد جان تخلص قدسی تھا، اور جو اس لائق تھا کہ اسے فخر شعرا کہا جاسکے، اس وقت کے فارسی گویوں اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ سکتا تھا؟"

جواب میں عرض ہے کہ اول تو قدسی کے ساتھ "فخر شعرا" کی شمولیت سے یہ نتیجہ اخذ کرلینا کہ وہ قدسی ہی کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، محض قیاسی رائے زنی ہے، اس کو قطعیت کا درجہ بالکل نہیں دیا جاسکتا، یہ عام بات ہے کہ تذکرہ نویس

(نقاد اور محقق نہیں) مورخ، سیرت نگار، وغیرہ ان لوگوں کے لیے جن کا ذکر وہ کسی وجہ سے عقیدت مندی یا احترام کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، اور ان کے ذاتی صفات یا خصوصیات کو امتیازی حیثیت دینا چاہتے ہیں، ان کے نام کے اول یا آخر بڑے بڑے مبالغہ آمیز تعریفی اور توصیفی کلمات الفاظ اور فقرے جوڑ دیتے ہیں، اس قسم کی مدح سرائی فارسی اور اردو ادب کی نمایاں خصوصیت رہی ہے، اور اس سے ہر ذی علم بخوبی واقف ہے لہذا "فخر شعرا" کا کلمہ کسی امتیازی خصوصیت کا حامل نہیں، تذکرہ نویس ہوں یا مرتبین کلام جس سے خوش ہوے یا جس کو خوش کرنا چاہا اور ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا مقصود ہوا تو کوئی نہ کوئی مہتم بالشان قسم کا لقب نام کے ساتھ شامل کر دیا، مبالغہ آمیز القاب کا استعمال تذکرہ نگاروں خاص طور سے متاخرین نے عام طور سے کیا ہے، اگر ان تذکروں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی،

اس بات کے ثبوت کے لیے میں اسی شخص کا بیان نیچے پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے "فخر شعرا" کا فقرہ استعمال کرکے ہم سب کو اور خصوصیت کے ساتھ فاضل مضمون نگار کو وہم میں ڈال دیا ہے، گپتا صاحب نے (صفحہ ۲۹۸ پر) لکھا ہے کہ کتاب (یعنی خمسہائے غزل قدسی یا چمن مدح نبی) کے آخری صفحات میں تحسین کا ایک طویل اور معنی خیز قطعہ "در ذکر شعراء" ہے، جس میں مرتب سمیت ایک سو سات (۱۰۷) شعراء کا ذکر ہے، جن کے خمسے زینت کتاب ہیں، یہ بات واضح ہے کہ چند بڑے سخنوروں کو چھوڑ کر جیسے غالب، مومن، ظفر، آزردہ، صہبائی . . . . سب دوسرے معمولی درجہ کے شاعر ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ تحسین (مرتب مجموعہ) نے ان سب کو

جو بہت بڑی اکثریت میں ہیں " اقلیم سخن کے سرور " کے بلند پایہ لقب سے یاد کیا ہے ،

ع ہیں یہ مشہور سب اقلیم سخن کے سرور

اور یہی نہیں بلکہ سخن رس ، سخن سنج ، بے مثل وعدیل (یہ سخن رس ہیں ، سخن سنج ہیں ، بے مثل وعدیل) بھی بتایا ہے ، جب ان معمولی شاعروں کو اقلیم سخن کے سرور ، سخن رس ، سخن سنج اور بے مثل وعدیل کہا جاسکتا ہے تو کسی دوسرے شاعر کو فخر شعرا کہہ دینا کون سی حیرت کی بات ہے ، اگر غور سے دیکھا جائے تو فخر شعرا ، اور اقلیم سخن کے سرور میں معنوی اعتبار سے سرمو فرق نہیں بلکہ فخر شعرا ، کے مقابلہ میں " اقلیم سخن کے سرور " میں زیادہ وزن اور جان ہے ، آگے چل کر (ص ۲۹۹ پر) گپتا صاحب رقمطراز ہیں : -

(اور قطعہ میں خود تحسین مجسم انکسار بنے دست بستہ کھڑے ہیں " ۔

ان میں تحسین بھی داخل ہے مگر جیسے فقیر | آگے شاہوں کے کھڑا ہوئے بحال ابتر

گویا ان اقلیم سخن کے سروروں کا مرتبہ اور بھی بڑھ گیا اور بمنزلہ شاہ ہوگئے ۔

کیا فاضل مقالہ نگار مجھے بتا سکیں گے کہ ان چند گنتی کے بڑے شاعروں کو چھوڑ کر معمولی شعرا میں سے کون کون اقلیم سخن کے سرور کہلانے کے صحیح معنوں میں مستحق ہیں ، کیا واقعی اس وقت کے " نامی گرامی شعرائے ہند "[1] ، مثلاً " میاں اوج ، خیر الدین تخلص خیر ساکن پانی پت قوم شیخ ، میاں ذائق ، مرزا پیارے صاحب میاں رحمت صاحب ، میاں احمد خان دہلوی شریر تخلص ، مرزا حاجی صاحب تخلص شہرت ، میاں خان صاحب دہلوی صفیر تخلص ، سید حیدر علی صاحب جالیسری المتخلص بہ طیب حضرت مولانا مولوی محمد ظہور علی صاحب تھانہ دار ظہور تخلص ، میاں عاجز صاحب سلمہ اللہ تعالے ، منشی عزت سنگھ صاحب دہلوی تخلص عیش ، حکیم آغا جان صاحب عیش

[1] نامی گرامی شعرائے ہند ، کا فقرہ خصوصی توجہ کا طالب ہے ۔

میاں عبد الغنی صاحب ساکن بریلی غنی تخلص ، میاں فنا صاحب ، مرزا منجھلے صاحب المتخلص بہ فسون ، کیفی صاحبہ از خاندان امیر تیمور ، میاں مخیر صاحب ، میاں دلدار علی صاحب مذاق تخلص ، محمد اکبر متوطن سہراده (؟) تھانہ دار بہم (؟) مخلص تخلص ، سید محمد علی کمن پوری معز تخلص ، میاں فہر صاحب ، مرزا جمعیت شاہ صاحب ماہر تخلص ، مرزا علی صاحب نازنین تخلص ، میاں نامی ، سید احمد حسن تخلص صارم وغیرہم[2] میں سے ایک بھی اس قابل ہے ، کہ اسے اقلیم سخن کا سرور کہہ کر پکارا جائے یا " نامی گرامی شعرائے ہند " کے زمرہ میں شمار کیا جائے ؟

اگر سیرت نگاری کا یہی معیار ہو کہ مدحیہ القاب کو سامنے رکھ کر ہی کسی شاعر کا ذکر خواہ وہ کتنے ہی معمولی درجہ کا کیوں نہ ہو تذکروں میں درج کیا جانا چاہیے تو پھر ان سب معمولی حیثیت کے شعرا کے حالات جن میں سے ہر ایک کو تحسین نے " سرور اقلیم سخن " کہا ہے ، ضرور اس عہد کے تذکروں اور تاریخوں کی زینت ہونے چاہئے تھے ،

اس بات کا کھلا ہوا ثبوت کہ جوش غلو میں تذکرہ نویس یا شاعر اپنے ممدوح کی ذات کو کس درجہ والا صفات اور عالی مقام بنا دیتے ہیں ، تحسین کے اس توصیفی شعر سے ملتا ہے ، جو اس نے کتاب کے آخر میں اپنے قطعہ " در ذکر شعرا " میں بہادر شاہ ظفر کے لیے لکھا ہے ، گپتا صاحب کے بیان (ص ۲۹۸) کے مطابق قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ، یعنی

معنی بیت دو عالم شہ ذیجاہ ظفر[3] | معنی لفظ سخاوت شہ با فتح وظفر

ظاہر ہے کہ معنی بیت دو عالم کہہ کر ظفر کا درجہ کس قدر بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے ، اس کے علی الرغم غالب جیسے عظیم شاعر اور صاحب فن کے لیے صرف ماہر فن سخن ، کا لقب کافی سمجھا گیا ، یعنی : -

[2] ان نام نہاد نامی گرامی شعرائے ہند کی فہرست خاصی طویل ہے ، میں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے ،

[3] (حاشیہ آگے صفحے پر ملاحظہ ہو)

ماہرِ فنِ سخن یعنی جناب غالبؔ کہ ہیں حُبِ اسد اللہ کے بیشک مظہر

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سیرت نگار یا شاعر حضرات کے بیانات کس درجہ ناقابلِ اعتبار اور بے بنیاد ہو سکتے ہیں اور ان کی تنقیدی بصیرت کس قدر قابلِ گرفت ہو سکتی ہے، لہذا ایسے مدحیہ القاب کو کسی تحقیقی نکتہ اور اصول کی بنیاد بنا لینا مناسب اور صحیح نہیں ہے،

۶۔ یہ صحیح ہے کہ مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ، سے وقت کی تعیین نہیں ہو سکتی لیکن عموماً کسی بھی شاعر کو جو فوت ہو چکا ہے خواہ وہ کتنا ہی عظیم اور ممتاز کیوں نہ ہو، مرحوم، اور رحمۃ اللہ علیہ، کے القاب کے ساتھ یاد نہیں کرتے،

گپتا صاحب لکھتے ہیں کہ "کوئی شخص کسی زمانہ میں فوت ہوا ہو اس کے لیے یہ الفاظ بولے اور لکھے جاتے ہیں"۔ میری حقیر رائے میں موصوف کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، اول تو یہ کہ یہاں معاملہ صرف ایک شخص کا نہیں بلکہ شاعر کا ہے، ادب اور شعر و شاعری کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ ڈالیے کسی بھی ادیب و شاعر کو خواہ وہ امتیازی حیثیت کا مالک ہی کیوں نہ ہو، اور وفات پا چکا ہو، مرحوم کہہ کر نہیں پکارا جاتا، وہ صرف اپنی ذات سے پہچانا جاتا ہے کسی نے سنا یا پڑھا نہ ہوگا کہ انگریزی کے کسی بڑے شاعر و ادیب مثلاً ملٹن، شکسپیر، کولرج، ورڈس ورتھ، ٹینی سن وغیرہ کے لیے 'late' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہو، یا پھر فارسی ادب کی تاریخ میں کہیں بھی مرحوم فردوسی، رودکی رحمۃ اللہ علیہ، مرحوم شیخ سعدی، افضل الدین خاقانی مرحوم و مغفور، مرحوم عبید زاکانی، خیام رحمۃ اللہ علیہ،

(حاشیہ ص ماقبل) گپتا صاحب کے مضمون میں ص ۲۹۸ پر یہ مصرعہ یوں لکھا ہوا ہے :- لفظ معنی سخاوت شہ با فتح و ظفر جو بظاہر صحیح نہیں ہے، یہ سہو یا تو تحسین کی خمسہ، غزل قدسی (چمن مدح نبی) کے کاتب سے ہوا ہوگا یا گپتا صاحب اس کی تصحیح نہیں کر سکے، یہ بھی ممکن ہے کہ موصوف سے سہو ہو گیا ہو یا پھر ان کے اسی مضمون کی کتابت کی غلطی ہے جو زیر نظر ہے،

مرزا حبیب قاآنی مرحوم، علامہ فقیہ محقق دوانی قدس اللہ سرہٗ یا سراج الدین علی خان آرزو مرحوم و مغفور وغیرہ کلمات لکھے ہوئے ملتے ہوں۔

متقدم اور متاخر تذکروں اور کتب تاریخ میں بھی عموماً متوفی شاعروں اور سخنوروں کے نام کے ساتھ یہ الفاظ منسلک نہیں ملتے، یہاں تک کہ قریب العہد شعرا کے لیے بھی عام طور سے یہ کلمات مستعمل نہیں، مثلاً کوئی بھی میر تقی میرؔ کو مرحوم میر تقی میرؔ یا غالب کو مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب رحمۃ اللہ علیہ یا مومنؔ و داغؔ کو حکیم مومن خان مومن علیہ الرحمۃ اور نواب مرزا خان داغ مرحوم و مغفور نہ لکھتا ہے، اور نہ کہہ کر پکارتا ہے، کہیں کہیں یہ کلمات خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کے لیے ضرور استعمال ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں، جو اپنے تقدس ذات کے لیے مشہور رہے لیکن ان کا شمار مستثنیات میں سے ہے،

۷۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حاجی شمشیر علی نے صحیفہ قدسی کی ترتیب و تدوین سے تقریباً گیارہ سال پہلے یعنی ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں مجموعہ نعت کے دو حصے چھپوا کر شایع کر دے تھے، اس بات سے اور خود اس کے اپنے قول سے کہ وہ "ہمیشہ سے رسول اکرمؐ کی مدح خوانی کا شایق تھا، . . . . . . الخ"

نعت گوئی یعنی شاعروں کے موزوں کردہ نعتیہ کلام اور بالخصوص مدح خوانی رسول اکرمؐ سے اس کا تعلق ثابت ہو جاتا ہے، اور یقیناً اسی بنا پر (جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے) حدیث قدسی یا قدسی سے کسی قسم کی واقفیت سے پیشتر ہی شائقین نعت رسولؐ کے مطالبات کے پیش نظر وہ نعت رسولؐ کے دو مجموعے ترتیب دے چکا تھا لہذا حاجی شمشیر علی کو قدسی سے اس معنی میں خواہ رسمی اور سطحی ہی کیوں نہ ہو، ضرور تعلق خاطر تھا کہ چونکہ مدح و نعت رسولؐ اس کا مشغلۂ خاص تھا لہذا خصوصی طور پر

ایک ایسے شاعر سے بھی، جس کی نعتیہ غزل شہرت عام کی حامل تھی، اور جس کے خمسوں اور تضامین کی جمع آوری اس کے فطری ذوق اور مادی ضروریات سے عین مطابقت رکھتی تھی، اس کو ایک طرح کی مناسبت پیدا ہو گئی تھی، اور ایسی صورت حال میں ایک قسم کا معنوی رشتہ قائم ہو جانا بالکل فطری امر تھا، جس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی، اسی قسم کا تعلق خاطر اس کو امیر خسرو دہلوی سے بھی تھا، جس کی تفصیل میں نے آئندہ سطور میں پیش کی ہے، علاوہ بریں اگر یہ شوق حدیث قدسی یا کسی اور مجموعہ تضامین کے مطالعہ کے بعد وجود میں آتا تو اس شوق کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوتی، لیکن چونکہ یہ سلسلہ پہلے ہی سے موجود تھا لہٰذا حدیث قدسی کو دیکھتے ہی اس کے شوق میں اضافہ ہو گیا، اور وہ غزل قدسی کے خمسوں کی جمع آوری اور تدوین میں لگ گیا، صرف یہی نہیں بلکہ جیسا کہ اس نے صحیفۂ قدسی کے آخر میں لکھا ہے، اس نے امیر خسرو کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے:۔

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آزری ہر چند وصفت می کنم در حسن زان زیباتری

کی تضمینوں کی جمع آوری کا سلسلہ بھی شروع کیا،[1] اور باقاعدہ اس کام کے لیے اخباروں میں اشتہار بھی دینا شروع کئے تھے، وہ لکھتا ہے:۔

"بندہ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کی غزل کے خمسے جمع کرنے شروع کئے ہیں، میرا ارادہ ہے کہ انشاء اللہ ان کو اسی طرح چھپوا دوں، اس لیے عرض ہے کہ جن صاحب کے پاس اس غزل کا خمسہ یا مثلث یا مسدس ہو یا اب طبع آزمائی فرمائیں اور مجھ کو مرحمت کریں تو میں بعد چھپنے کے ایک کتاب ان کو نذر کر دوں گا"[2]

[1] اس بات کا ذکر میں نے اپنے گزشتہ مقالہ میں کیا ہے [2] کیا خسرو کی غزل کے خمسوں کی ترتیب اور جمع آوری کیلئے بھی اس نے کسی حدیث قدسی یا جریدہ روزگار سے سرقہ اور نقل کا بندوبست کر لیا تھا؟

غزل یہ ہے:۔

ای چہرۂ زیبائے . . . . الخ

دو گذشتہ مجموعہ ہائے نعت تو اس نے طالبین و شائقین مدح رسول اکرمؐ کی خواہش اور تقاضوں کے جواب میں ترتیب دیے تھے، لیکن غالباً خسرو کی غزل کے خمسوں کی تدوین و جمع آوری کا خیال اور شوق اس کو از خود اپنے فطری ذوق و ضرورت کی بنا پر پیدا ہوا تھا اگر اس کو اس شغل سے مناسبت نہ ہوتی تو وہ خود ہی بغیر کسی کے ایماء و سفارش کے اس چیز کو اخباروں میں مشتہر کیوں کراتا، حدیث قدسی کے مطالعہ کے بعد شاعر متذکرہ کی غزل پر کہے ہوئے خمسوں کی جمع آوری کی خواہش کا ذکر وہ کچھ اس طرح پر کرتا ہے کہ گویا اس کے لیے شاعر کی شخصیت جانی بوجھی سی ہے، وہ لکھتا ہے:

"پھر میری نظر سے حدیث قدسی گذری جو کہ ۱۲۷۳ھ میں قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی، اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا کہ میں بھی قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں۔"

"قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں"، کا ٹکڑا اظاہر کرتا ہے کہ غالباً مولف اس کی ذات سے اگر واقف نہیں تو ناآشنا بھی نہیں، گپتا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ یعنی حاجی شمشیر علی قدسی سے واقف نہ تھے"[1] اگر واقف نہیں تھے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ناواقفیت کے عالم میں انھوں نے اس کا نام لیتے وقت شناسائی کا لہجہ کیوں استعمال کیا، اگر یہ سمجھا جائے کہ چونکہ قدسی مشہدی کی ذات متعارف خاص و عام تھی لہٰذا جب بھی کہیں کوئی شخص قدسی کا نام لیتا تو لازماً قدسی مشہدی مراد لینا ہوتا تھا تو پھر قدسی کی دوسری خصوصیات کا علم بھی اس سے متوقع ہونا چاہئے تھا

[1] ملاحظہ ہو ص ۳۰۸

بہرحال ایک ایسے شخص کے لیے جس سے کسی قسم کی واقفیت نہ ہو، عام طور سے بے تکلفی اور آشنائی کا یہ انداز نہیں اختیار کیا جاتا، اور پھر گپتا صاحب یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حاجی شمشیر علی قدسی سے واقف نہ تھے جب کہ فاضل مقالہ نویس اس سے پہلے اپنے مضمون کے صفحہ ۳۰۶ پر لکھ آئے ہیں کہ حاجی سید شمشیر علی نے حاجی محمد جان قدسی کو عمداً دہلوی لکھا ہے گویا مرتب صحیفہ قدسی کو شاعر (قدسی) کے بارے میں کم و بیش ساری ضروری باتوں کا علم تھا، یعنی نام، تخلص، جائے سکونت وغیرہ، نیز یہ بھی علم تھا کہ وہ انتقال کر چکا ہے تبھی تو مرحوم اور رحمۃ اللہ وغیرہ لکھا، اس کے تقدس ذات کی خصوصیت کا بھی بخوبی علم تھا، تب ہی تو حضرت اور مولانا کے القاب استعمال کئے اگر علم نہیں تھا تو بدقسمتی سے صرف اس بات کا کہ وہ حاجی بھی تھا، گویا ناواقفیت کی منزل صرف بجائے 'حاجی' مولانا کے لفظ کے لکھنے سے شروع ہوتی ہے، اور وہیں پر ختم ہو جاتی ہے، قیاس یہی کہتا ہے کہ جب دوسری باتوں کا علم تھا تو یہ بھی علم ہونا چاہئے تھا کہ قدسی حاجی بھی تھا، بہرحال فاضل مقالہ نگار کا ایک جگہ (ص ۳۰۶) حاجی شمشیر علی کو قدسی کا واقف حالات اور دوسری جگہ (ص ۳۰۸) ناواقف قرار دینا ان کے استدلال کو قطعی کمزور اور پھسپھسا بنا دیتا ہے، گپتا صاحب کا دوسرا بیان حسب ذیل ہے،

"اگر محمد جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو انکی عدم واقفیت ہے چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے، اس لیے انھیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ قدسی حاجی بھی تھے، چنانچہ انھوں نے قدسی کو احتراماً مولانا لکھ دیا۔"

اس طرح خود گپتا صاحب کے اس بیان سے حاجی شمشیر علی کے دل میں شاعر

کے لیے جذبہ احترام کی موجودگی کا ثبوت مل جاتا ہے، لیکن تعظیم کا یہ احساس محض اتفاقی امر نہیں معلوم ہوتا، سرورق پر "حضرت مولانا محمد جان صاحبؒ قدسیؒ" اور اصل متن میں مضمون کے آغاز سے پہلے عنوان میں بھی "حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی" لکھا ہوا ہے، اگر توجہ اور غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو 'حضرت' 'مولانا' 'صاحب'، 'رحمۃ اللہ علیہ' کے کلمات سے قدسی کی شخصیت کے تعین میں مدد مل سکتی ہے، یہ فقرے یا الفاظ عام طور سے ایسے اصحاب کے لیے مستعمل ہوتے ہیں، جو لوگوں کی نظروں میں (غالباً) اپنی نیکی، ذاتی فضیلت یا درویش منشی اور تقدس ذات کی وجہ سے مستحق تعظیم اور مرجع احترام ہوتے ہیں، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ اس تعلق خاطر کا سرچشمہ وہی احساس عقیدت یا جذبہ احترام ہو جس کی جانب راقم الحروف نے اشارہ کیا ہے، جب ایسی صورت حال ہو تو حاجی شمشیر علی کا شاعر متذکرہ سے کسی قسم کی عقیدت قائم کر لینا نہ تو غیر فطری ہے اور نہ غیر ممکن یا محال،

امیر حسن نورانی صاحب نے بھی جنھوں نے کلیات غالب (فارسی) کی تدوین کی ہے، اس شاعر کے لیے جس کی نعت پر غالب نے اپنی تضمین لکھی ہے 'مولانا' اور 'قدس اللہ سرہٗ' کے تعظیمی کلمات استعمال کیے ہیں، اور تضمین ہذا کا مندرجہ ذیل عنوان قایم کیا ہے،

خمسہ غالب بر غزل مولانا قدسی قدس اللہ سرہٗ

ان شہادتوں کی روشنی میں بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت بزرگ و محترم رہی ہوگی ورنہ وہ 'حضرت' 'مولانا' 'صاحب' 'رحمۃ اللہ علیہ' اور بالخصوص قدس اللہ سرہ کے القاب سے یاد نہ کیا جاتا، یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ نورانی صاحب کے لیے کون سا امر مانع تھا کہ وہ قدسی کے لیے مشہدی کی نسبت

کی تصریحت بازنہ ہے، جب کہ یہ یقین ہے کہ اس کی شخصیت ادبی اور علمی دنیا میں خاصی مشہور اور متعارف ہے، خود غالب نے بھی اپنے ادبی خطوط میں چند علمی و ادبی مسائل کی وضاحت کے سلسلہ میں قدسی مشہدی کا ذکر کیا ہے، اور بیشتر حاجی محمدؐ جان قدسی لکھا ہے۔[1] فارسی کلیات غالب کے فاضل مولف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ۔

"کلیات غالب کا یہ اڈیشن غالب کی وفات کے سو سال بعد شایع ہو رہا ہے، اس کی ترتیب و تصحیح کی بنیاد انہیں دو مستند نسخوں پر ہے، جو غالب نے خود شایع کرائے تھے، ایک نسخہ مطبع دار السلام (۱۸۴۵ء) دوسرا مطبوعہ نولکشور (۱۸۶۳ء) متفرق کلام جو ان دونوں نسخوں کے علاوہ تھا، وہ ان مطبوعہ انتخابات اور کتابچوں سے لیا گیا ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصل ماخذ یا ماخذوں میں بھی خمسہ غالب کا وہی عنوان ثبت ہوگا جو نورانی صاحب نے درج کیا ہے، اور اگر غالب کی یہ تضمین قدسی مشہدی کی نعتیہ غزل پر کہی گئی ہوتی تو غالب گمان یہی ہے کہ اس پر حاجی وغیرہ الفاظ کی تصریح بھی شامل ہوتی جیسا کہ خطوط غالب میں عموماً کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) محاورہ "آب در بنا رسیدن" اور "بنا بہ آب رسانیدن" کی بحث کے سلسلہ میں غالب نے شاعر کا پورا نام حاجی محمدؐ جان قدسی لکھا ہے،[2] اور اس کا مندرجہ ذیل بیت بطور شہ پیش کیا ہے جو قدسی مشہدی کے دیوان میں ملتا ہے،

بگو عطا لشس رساند این خطاب — کہ بنیاد کان را رساند با آب[3]

---

[1] ملاحظہ ہو ادبی خطوط غالب، مولفہ مرزا محمد عسکری۔ [2] اگرچہ مشہدی کی صراحت نہیں لیکن دوسرے شواہد سے قطعی ثابت ہوتا ہے کہ قدسی مشہدی ہی ان معروضات کا مرجع ہے جیسا کہ میں نے متن میں اسی صفحہ پر عرض کیا ہے۔ [3] ادبی خطوط غالب، تدوین عسکری، ص ۹۰

اہل زبان، رسالہ قواعد فارسی، الغت و فرہنگ نویس اور رشید اسکروی اور قدسی مشہدی کے درمیان ادبی و شعری مناقشہ کی بحث کے ذیل میں بھی حاجی محمدؐ جان، قدسی ہی لکھا ہوا ملتا ہے۔[1]

(۳) اسی موضوع و بحث کے تحت:۔

"خلاصہ مضمون خط یہ کہ نہ تو صاحب زبان ہے نہ زبان دان ہے، یعنی مقلد ادیم کاسہ لیس اہل ایران ہے۔ حاجی محمدؐ جان کے کلام کو سند پکڑ، تجھے کس نے کہا ہے کہ اس سوختہ کو سچا جانے"[2] پھر صرف "قدسی" لکھا ہوا ملتا ہے جیسا کہ اسی تالیف یعنی ادبی خطوط غالب مولفہ مرزا محمد عسکری میں صفحات ۸، ۱۰، ۵ وغیرہ پر درج ہے، بہرحال ان قرائن و شواہد کی بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالبؔ حاجی محمدؐ جان قدسی مشہدی اور مولانا قدسی دہلوی دو جداگانہ اور مختلف شخصیتیں ہیں، اور ان کو ایک سمجھنا قرین صواب نہیں،

میرے سامنے جو حدیث قدسی کا نسخہ ہے اس میں (بطور عنوان) ص ۲۰۵ پر عبارت "خمسہ محمدؐ شاہ میر صاحب دہلوی طراز تخلص" (یعنی بغیر تشدید رای مہملہ) درج ہے، مقطع میں بھی "طراز" بالکل صاف طور پر غیر مشدد لکھی ہوئی ہے، نیز اسی نسخہ میں غزل در ذکر شعرا والے مصرعہ میں بھی یہ لفظ بغیر تشدید مرقوم ہے، جس کو میں نے بجنسہ اپنے گذشتہ مضمون میں نقل کر دیا ہے، لفظ "طرّاز" بھی ہو سکتا ہے اور "طراز" یعنی بغیر تشدید بھی، اگر کسی نسخہ میں تشدید کی نشاندہی نہ ہو تو مضمون نگار کے ذہن کا طراز سے طرّاز کی طرف منتقل نہ ہو پانا ایک ایسا فطری اور بشری سہو ہے کہ جس کی طرف اگر اشارہ نہ کیا جاتا تو زیادہ بہتر اور مستحسن ہوتا۔ اور پھر یہ کوئی ایسا معرکۃ الآرا قسم کا تحقیقی نکتہ

---

[1] ادبی خطوط غالب تدوین عسکری ص ۱۰۰ [2] ایضاً ص ۱۰۱

یا کارنامہ بھی نہیں جس کا ذکر کرنا اور اس کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا ایک لازمی امر قرار پاتا، ویسے راقم الحروف نے جو بات لکھی ہو وہ فی نفسہٖ صحیح ہو، غلط قطعی نہیں، اگر اس کے برعکس ضبط تحریر میں لائی جاتی تو البتہ فاضل مقالہ نگار کو حق حاصل ہوتا کہ وہ اس کی نشاندہی کر دیتے، چونکہ وہاں طرّاز (تشدید کے ساتھ) درج نہیں تھا، لہٰذا میں نے اس کی صراحت کر دی اور نتیجہ یہی نکلا جو گپتا صاحب نے لکھا ہے، یعنی لفظ (تخلص) طرآنہ ہے نہ طراز۔

محترم گپتا صاحب نے میرے پیش کردہ تمام وجوہ کا نمبر وار جائزہ لیا ہے، اور ان کا جواب بھی دیا ہے، لیکن زیر بحث نعتیہ غزل اور حاجی محمدؐ جان قدسی مشہدی کے کلام کے درمیان اسٹائل اور طرز ادا کا جو بیّن فرق نظر آتا ہے، اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں تحریر فرمایا، اور دونوں کے طرز شاعری میں واضح اور نمایاں فرق کے نکتہ کے بارے میں جس کو میں نے خصوصیت کے ساتھ واضح کیا ہے، انھوں نے شاید اس وجہ سے کہ کلام قدسی مشہدی کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا ہے، اپنی کوئی رائے نہیں پیش کی، حالانکہ میرے نزدیک کسی شاعر کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس کے کلام کا اسلوب ایک نہایت اہم نکتہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی رہنمائی میں کبھی کبھی کسی پیچیدہ اور مشکل علمی یا ادبی مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے، یہ بات اب بھی بڑے وثوق اور پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نعت متداولہ کا مجموعی اسلوب حاجی محمدؐ جان قدسی مشہدی کے کلام کے عام طرز سے بالکل الگ ہے، اور دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے، لہٰذا نعت قدسی کے مصنف اصلی کو سراغ اور تعیین کے وقت اس اہم نکتہ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ میں گذشتہ مضمون میں عرض کر چکا ہوں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ غزل مذکور کا سبک کسی ہندوستانی شاعر کا ہے، اور قدسی مشہدی کے اسٹائل اور طرز شاعری سے بہت مختلف ہے،

جیسا کہ میں نے اپنے گذشتہ مقالہ میں بھی عرض کیا ہے نعت یا غزل مذکور کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی تصنیف ماننے میں مجھے سب سے بڑا تامل اس بنا پر ہے کہ یہ اس کے کسی بھی متقدم یا موخر مجموعہ کلام میں دستیاب نہیں، گپتا صاحب کا یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے کہ "متداول نسخوں (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شاعر کے سارے کلام کا شامل ہونا ضروری نہیں"، لیکن اس صورت میں محض قلم کی ذرا سی جنبش سے، یہ کہہ کر موصوف اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ کلیات یا دواوین (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شامل نہ ہونے کے باوجود یہ نعت قدسی مشہدی ہی کی ملک ہے تو گپتا صاحب کو اس کے اثبات کیلئے بڑے ٹھوس اور مستند دلائل پیش کرتے ہوں گے،

بجائے اس کے کہ وہ کسی طرح مثبت اور موثر دلائل اختیار کرتے اور مستند شہادتوں کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ نعت یا غزل متذکرہ حتماً حاجی محمد جان قدسی ہی کی تصنیف ہے، انھوں نے ایک لحاظ سے بحث کا منفی پہلو اختیار کر لیا ہے، یعنی نعت قدسی کے مصنف اصلی پر بحث کرنے کے بجائے، غزل قدسی کے مخمسات کے اولین اور اصل مولف کے موضوع پر زیادہ روشنی ڈالی ہے، نیز اس بات کی کوشش کی ہے کہ قاضی محمدؐ عمر مرتب حدیث قدسی اور حاجی سید شمشیر علی مولف صحیفہ قدسی کو سارقین اعظم اور انکی جمع کی ہوئی قضا مین کو زبردست سرقہ ثابت کر دکھائیں، اور یہ فیصلہ قطعی بھی صا کر دیں کہ قدسی دہلوی کی شخصیت بالکل مفروضہ ہے، فاضل مقالہ نگار ان مرتبین کے بیان تحریر کو اس لیے قابل اعتبار نہیں سمجھتے کہ وہ "دونوں قطعی نامعتبر شخصیتیں ہیں"، ظاہر ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ ان نامعتبر اور سارق قسم کے اصحاب کے اقوال و بیانات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا غزل مذکور کی قدسی دہلوی کے ساتھ قائم کردہ نسبت بھی قابل

اعتبار نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سرقہ شدہ تضامین کے مجموعہ میں انتساب فرضی اور غلط ہے تو اس سے ماقبل کے قابل اعتبار یا وثوق اور صحیح المضمون مجموعہ میں قدسی مشہدی کے نام کا واضح اور صریح حوالہ کیوں نہیں ملتا، حیرت کی بات ہے کہ دو سو سال سے زائد مدت[1] کی گمنامی کے بعد یہ غزل اچانک منصۂ شہود پر اس انداز سے اُبھری کہ چار دانگ ملک میں غلغلہ مچ گیا، اور اس درجہ مشہور ہوئی، اور ہندوستانی شاعروں کو اس قدر بھائی کہ سنہ ۱۲۷۰ھ (سنہ ۱۸۵۴ء) سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک دیا اس کے بعد بھی جب تک کہ اخبار جریدہ روزگار، مدراس سنہ ۱۹۰۳ء یا سنہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا، سیکڑوں[2] کی تعداد میں خمسے نظم کر دئے گئے، لیکن مرتبین یا مالکان اخبار میں سے کسی ایک نے بھی مصنف اصلی کا نام تک نہیں لیا، اور اس حقیقت کے تذکرہ سے سب خاموش رہے،

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اتنی مدت کے بعد تضمینوں کا یہ سلسلہ کیوں جاری ہوا، یعنی اس سے پہلے خمسہ نگاری کے لیے کون سے امور مانع تھے؟ کیا اس سے پہلے یہ غزل مقبولیت اور شہرت کی حامل نہ تھی؟ اسی طرح یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ معاصر دور میں کسی بھی ذی علم اور دانشور محقق[3] نے قدسی مشہدی کے حالات زندگی یا اس کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس نعت یا اس کی مقبولیت یا اس پر لکھی ہوئی تضامین کا حوالہ نہیں دیا۔

---

[1] قدسی مشہدی کا انتقال سنہ ۱۰۵۶ھ میں ہوا، اور محمد حسین خان تحسین کی کتاب سنہ ۱۲۷۱ھ میں شایع ہوئی۔ [2] تاریخ اشاعت خمسہ ہائے غزل قدسی (چمن مدح نبی) مرتبہ محمد حسین خان تحسین [3] جیسے (مرحوم) پروفیسر محمد شفیع، مولف تذکرہ میخانہ عبد النبی فخر الزمانی (جس میں قدسی اور اس کے کلام کا ذکر ہے) وغیرہم، شاید جناب قاضی عبد الودود صاحب نے بھی اپنے کسی مقالہ میں قدسی مشہدی کی طرف اس غزل کے انتساب کی تردید کی ہے،

یہ بات بھی سمجھ میں نہ آسکی کہ محض "خمسہ ہائے غزل قدسی" یا "غزل قدسی فخر شعرا" یا "تضمین بر غزل قدسی" لکھنے یا کہنے سے قدسی مشہدی کی نسبت اور اس کی تاویل کی گنجایش کس طرح نکل سکتی ہے،؟ اگر بالفرض حدیث قدسی کو خمسہائے غزل قدسی (از محمد حسین خان تحسین) کا سرقہ مکمل اور صحیفہ قدسی کو حدیث قدسی نیز اخبار جریدہ روزگار (مدراس) میں چھپنے والی تضمینوں کی نقل تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ نعت مذکور بطور قطعی حاجی محمد جان قدسی مشہدی ہی کی فکر کا نتیجہ ہے، بلاشبہ تحسین کا مجموعہ، خمسہائے غزل قدسی، (چمن مدح نبی) متقدم (یا گپتا صاحب کے قول کے مطابق پہلا) مجموعہ تضامین قرار پاتا ہے، جس میں مخمسات غزل قدسی جمع کئے گئے ہیں[1] لیکن اس نسخہ کے متقدم یا اولین ہونے سے بھی مسئلہ کا کوئی حل ہمارے سامنے نہیں آتا، بات تو اس وقت بنتی جب کہ مجموعہ بالا میں صراحت ہوتی کہ خمسے جو جمع کیے گئے ہیں، وہ حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی نعتیہ غزل پر بطور تضمین نظم کیے گئے ہیں، بہر حال تحسین جیسے باکمال اور واقف کار شاعر اور مولف کے قلم سے شاعر اصلی کے نام اور نسبت کی عدم وضاحت کے باوجود یہ نتیجہ محض قیاساً اخذ کر لینا کہ مصنف اصلی قدسی مشہدی دا سلیے کہ وہ زیادہ مشہور رہے) ہو سکتا ہے، قطعی قرین صواب نہیں،

گپتا صاحب رقمطراز ہیں کہ خمسہ ہائے غزل قدسی، مرتبہ محمد حسین خان تحسین سنہ ۱۲۷۱ھ (مطابق سنہ ۱۸۵۴ء) میں شایع ہوئی، اور حدیث قدسی مرتبہ قاضی محمد عمر سنہ ۱۲۷۹ھ (سنہ ۱۸۶۲ء) یا سنہ ۱۲۸۱ھ (مطابق سنہ ۱۸۶۴ء) میں چھپ کر منظر عام پر آئی، گویا

---

[1] میں نے خود بھی حتمی دعویٰ نہیں کیا کہ "حدیث قدسی" تضامین کا پہلا اور اولین مجموعہ ہے، اسکے بارے میں میرا بیان یہ تھا، "اور غالباً یہ پہلی کوشش تھی جو اس ضمن میں وجود میں آئی (معارف دسمبر ۸۶ء)

دونوں کتابوں کی طباعت میں آٹھ، دس سال کا فرق ہے تعجب کی بات ہے اگر اس آٹھ دس سال کی مدت میں جو ایک ادبی فضا کے لیے کوئی بہت بڑی مدت نہیں ہوتی، لوگ تحسین کے مجموعے کو بالکل فراموش کر بیٹھے اور کسی بھی شاعر، عالم، مصنف یا ادیب نے قاضی محمد عمر کے اس زبردست جعل اور سرقہ کی نشاندھی نہیں کی اور نہ ہی کوئی بازپرس کی، بلکہ اس عظیم، کھلم کھلا چوری اور نقل کو سب نے بے چون وچرا قبول اور برداشت کر لیا، فاضل مضمون نگار کے بیان سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ گویا قاضی محمد عمر[1] ۱۲۷۲ھ میں حدیث قدسی کی ترتیب کا ارادہ اپنے ذہن میں قائم کر کے غدر یعنی جنگ آزادی کی آمد کا انتظار کرنے لگے کہ جیسے ہی نظام درہم برہم ہو، حالات بگڑیں اور لوگوں (بالخصوص ارباب علم وذوق) کے ذہنوں سے تحسین کی چمن مدح نبی، محو ہو وہ اس کی ہو بہو نقل بنام حدیث قدسی بہت معمولی حذف اور اضافہ کے ساتھ اپنے نام چھاپ دیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران سارا سیاسی، اجتماعی اور تہذیبی شیرازہ بکھر چکا تھا، اور چہار طرف انتشار، بدامنی اور بربادی کا دور دورہ تھا، لیکن فتنہ وفساد فرو ہونے پر حالات معمول پر آنے لگے، حدیث قدسی کی اشاعت کے وقت نہ صرف غالب حیات تھے، بلکہ ان کے شاگردوں، شناساؤں اور کرم فرماؤں کی ایک کثیر تعداد زندہ اور موجود تھی جن میں سے بیشتر شاعر وادیب، مصنف اور صاحبان فضل وعلم تھے، مثلاً میر مہدی مجروح وغیرہ،[2] نیز تلامذہ صہبائی، وذوق بھی حیات اور موجود رہے ہوں گے،[3] فارسی گوئی اور فارسی خوانی کی گرم بازاری اس وقت بھی قایم اور جاری تھی

---

[1] یاد رہے کہ قاضی محمد عمر کے مجموعہ میں میر محمد مہدی مجروح کا خمسہ شامل ہے۔ [2] غالب گمان یہی ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے وقت خود محمد حسین خان تحسین بھی حیات ہونگے۔

اور علمی وادبی سرگرمیوں کا چلن باقی تھا، ان حالات میں کسی شاعر، عالم یا ادیب کا اتنے زبردست جعل کی طرف قطعی متوجہ نہ ہونا حیرت خیز بات ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ انیسویں صدی کے خمسہ گو اور تضمین نگاروں کے پیش نظر باوجود اس کے کہ (بظاہر) قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید کلیات یا دیوان قدسی (مشہدی) میں نعت متداولہ دستیاب نہیں تھی، ایسا کون سا نسخہ یا ماخذ تھا، جس میں یہ نعتیہ غزل موجود تھی اور جس کو بنیاد بنا کر اور جس سے متاثر ہو کر ہندوستان کے طول وعرض کے چھوٹے بڑے شعراء نے طبع آزمائی کی اور خمسے نظم کر ڈالے، یہاں تک کہ مدراس سے نکلنے والے ایک اخبار میں بھی ایک دو نہیں، بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں تضامین چھپ کر شایع ہو گئیں۔

لہذا کلیات، دواوین، تذکروں اور کتب تواریخ میں اس کی عدم موجودگی کی صورت میں ہمارے لئے کسی ایسے قابل اعتماد ماخذ کا پتہ چلانا ضروری ہوگا، جس کی صحت پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکے، اور جس سے قطعی طور پر اس غزل کی نسبت قدسی مشہدی کے حق میں ثابت ہو سکے، جب تک ایسی کوئی مستند دستاویز بطور ثبوت نہیں حاصل ہو جاتی یہ دعوی کہ نعت متذکرہ قدسی مشہدی ہی کی تصنیف ہے، از روی تحقیق صحیح نہ ہوگا۔

لاہور کے علمی تحائف

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

لاہور میں علامہ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کی جو بین الاقوامی کانگریس ہوئی، اس کا ذکر معارف کی گذشتہ تین اشاعتوں میں ہوچکا ہے، وہاں ایک ہفتہ کے قیام میں جو علمی تحائف ملے، ان کا ذکر بھی ضروری اس لئے ہے کہ جس محبت اور گرم جوشی سے یہ پیش کئے گئے، اس سے خود مجھ کو دار المصنفین سے اپنی وابستگی پر فخر ہوا، پھر ان کا ذکر اس لئے بھی آنا لازمی ہے کہ اس سے وہاں کی علمی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا حال بھی معلوم ہوسکے گا۔

ایک رات اپنے کمرہ میں واپس آیا تو علامہ محمد اقبال کے اشعار کو عبدالرحمٰن چغتائی نے جو مصور کیا ہے اس کا ایک نسخہ رکھا پایا۔ اس کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، یہ غالباً جشن ہی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا، مگر کوئی ایسی تحریر لکھی ہوئی نہیں پائی، ارباب جشن کے علاوہ کسی اور سے ایسی فیاضی کا اظہار ممکن نہ تھا، کیونکہ اس کی قیمت پندرہ سو روپئے ہے، اس کے بائیں جانب شروع میں جسٹس ایس، اے، رحمٰن کا انگریزی میں مقدمہ ہے، جس کے آخر میں ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۲ء کی تاریخ مرقوم ہے اس میں علامہ محمد اقبال کے مختصر حالات کے ساتھ ان کی شاعری پر بہت ہی عمدہ تبصرہ ہے، اس کے بعد انگریزی ہی میں 'چغتائی دی آرٹسٹ' کے عنوان سے ایک تحریر ہے' پھر اقبال کے اشعار اور کئی نظموں کے انگریزی ترجمے ہیں، یہ اشعار اسرار خودی، بال جبریل، ضرب کلیم، پیام مشرق اور جاوید نامہ اور زبور عجم سے لئے گئے ہیں، دائیں طرف شروع میں عبدالرحمٰن چغتائی کی تحریریں اردو میں ہیں جن میں

۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۸ء کی تاریخیں لکھی ہوئی ہیں، انھوں نے "قدر و قیمت" کے عنوان میں جناب ایس، اے، رحمٰن کا شکریہ ادا کیا ہے، جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں، وہ اس مصور ایڈیشن کی تیاری میں ان کے دکھ سکھ میں برابر ساتھ دیتے رہے، پھر وہ پروفیسر سید وقار عظیم کے بھی ممنون ہوئے ہیں جنھوں نے اس کے اردو مسودہ جات پڑھے معلوم ہوتا ہے کہ اس مصور ایڈیشن کی تیاری میں ان کو بعض حلقوں سے تکلیفیں بھی پہونچیں، جیسا کہ ان کی حسب ذیل تحریر کے تلخ لہجہ سے ظاہر ہوگا:

"علامہ اقبال کے اس مصور ایڈیشن کی تکمیل کے دوران مشکلات کے زیر اثر کچھ یوں محسوس ہوتا رہا کہ ابھی ہمارے یہاں ذوق نظری میں وہ وسعت پیدا نہیں ہوئی کہ کوئی احساس مند فراغت و یکسوئی کے ساتھ معاشرے کی علمی و ادبی خدمت انجام دے سکے' بعض کم نظر افسروں نے اپنی کم ظرفی کو بلند نگاہی پر ترجیح دی، تنگ ساماؤں نے صدمے صدمے پہونچائے مگر اپنے اعتماد نے انا کو ٹھیس نہ لگنے دی۔ اس خیال سے بھی کہ منزل تک پہونچنے کے راستے میں طوفانوں اور چٹانوں کا حائل ہونا فطرت کا تقاضا ہے۔"

انھوں نے 'فرد اور جماعت' کے عنوان سے وہ ساری مشکلات بیان کردی ہیں جو ان کو اس مصور ایڈیشن کی تیاری میں پیش آئیں مگر وہ بددل نہیں ہوئے، ان کو اقبال سے والہانہ عقیدت تھی، اسی لئے انھوں نے ان کی فلسفیانہ اور شاعرانہ تخیل خیزیوں کو رنگوں اور خطوں میں ڈھال کر جمالی اور جلالی صورت کے ایک پیکر کی صورت میں پیش کیا، پھر دیدن دگر آموز کے عنوان سے مصوری کے آرٹ اور اقبال کی شاعری پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھنے میں ان کے ناظرین کو وہی حظ و لطف ملے گا جو ان کی مصوری کو دیکھنے میں ملتا ہے، انھوں نے اپنی تحریروں میں بھی مصورانہ رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے، ان کی تحریر کے حسب ذیل اقتباس کو ذرا غور سے پڑھنے اور سوچنے کی ضرورت ہے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے:

اور اگر صحیح ہے تو تاریخ کے اس نچوڑ سے کیا سبق لیا جا سکتا ہے:

"علامہ اقبال نے ایک موقع پر سوال کیا تھا کہ عرب اور عجم کے فن میں تمھیں کیا نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ یہ سوال کیا اور وہ کمر کو سیدھا کر کے یوں بیٹھ گئے، جیسے ماضی کے فن کا کوئی بہت بڑا مبصر ہو، وہ الفاظ جن میں اپنی بات میں اس وقت ادا کر سکا ان کا لب لباب یہ تھا کہ وہ تلوار جو عرب میں بالکل سیدھی تھی، عجم تک پہونچتے پہونچتے اس میں خم آگیا تھا، اس میں لوچ لچک بھی تھی، وہ مرصع بھی تھی اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ تلوار جو زندگی کی بلندیوں اور وسعتوں کی رشتہ دار تھی، قنوطیت اور رہبانیت میں مدغم ہو کر میانوں کی زینت بن گئی۔"

پھر اس ایڈیشن کی تصویروں پر یہ تبصرہ بھی ہے کہ یہ نہ محض ہنگامی ہیں اور نہ محض جذباتی ہیں، یہ خون جگر اور جوئے شیر کا کرشمہ ہیں۔ ان کے خد و خال، بلند نگاہی سے حاصل کئے گئے ہیں، ان میں جلال و جمال کی نمود بھی ہے، حسن و عشق کی جولانیاں بھی اور بصیرت اور خودنمائی کے جوہر بھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس میں انھیں شعروں کو مصور کیا گیا جو رنگوں اور خطوں کے سانچے میں ڈھل سکتے تھے، اس کے بعد مصوری کے نمونے شروع ہو گئے ہیں، جو شعر مصور کیا گیا ہے اس کا عنوان فاضل آرٹسٹ نے خود انتخاب کیا ہے، مثلاً اقبال کا شعر ہے ؎

یک نظر آں گوہر نابے نگر   تاج را در زیر مہتابے نگر

اس کا عنوان 'داستان گو' رکھا، پھر اس کی تصریح ایک باوقار نثری تحریر میں کی گئی ہے جس کا خلاصہ انگریزی میں بھی مختصر طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقبال کے اس شعر کا عنوان 'رنگ و بو' رکھا گیا ہے:

یا حسن ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا   حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

اس کی تصریح بھی اردو اور انگریزی کی نثری تحریروں سے کی گئی ہے۔ اسی طرح غلام لڑکی، زوال بغداد، سیب کا درخت، اختر صبح، جلال و جمال، ناقۂ لیلیٰ، چشمۂ ارتقار، دانائے راز، جہانگیر اور نور جہاں، برق نگاہ، سوز درون، مرد حر، زبیدہ خاتون، خرقہ پوش، اقبال و رومی، معمار حرم، شریف النسا وغیرہ کے عنوانات قائم کر کے ان سے متعلق اشعار کی جو مصوری کی گئی ہے، ان کی تشریح بھی اردو اور انگریزی نثر میں کی ہے، اقبال اور رومی، منصور حلاج، اورنگ زیب، بابر اور ہمایوں، سلطان شہید وغیرہ کی مصوری کے جو نمونے ہیں وہ تو بہت اچھے معلوم ہوئے، مگر مرد شاہین، مرد مومن، صورت و سیرت اور ہفت کشور کی جو مصوری ہے، اقبال زندہ ہوتے تو معلوم نہیں ان تصویروں کی داد دیتے کہ نہیں، اس ایڈیشن میں مصوری کے نمونے کے پیش کرنے کا وہی انداز ہے جو غالب کے مصور دیوان میں ہے، مگر دونوں کے مصور ایڈیشنوں میں وہی فرق ہونا چاہئے تھا جو دونوں کی شاعری میں ہے، غالب بنیادی حیثیت سے ایک غزل گو شاعر تھے، اقبال ایک ایسے شاعر تھے جو خود فاضل مصور کی رائے کے مطابق کسی بڑی دانش کی جستجو میں رہے، جو ایسے انکشاف کے خواہاں رہے جو کائنات کا مظہر ہو، ان کو ماضی کے آئینے میں سب کچھ نظر آتا تھا، ان کی نظر کے سامنے مرد کامل کا نکھرا ہوا پرنور چہرہ تھا، مرد مومن کے خد و خال تھے اور ان مجاہدوں کا خون جنھوں نے انسانی قدروں کو دنیا میں عام کرنے کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دیں، وہ جانتے تھے کہ وہ قوت عمل رائگاں نہ جائے جس سے انسان کی ترقی کی بڑی بڑی منزلیں سر کی گئی تھیں، ان ہی کی روشنی میں اقبال کے اشعار کی مصوری میں جمالی کے بجائے جلالی نظارہ کو دیکھنے کی خواہش فطری طور پر ہوتی ہے، اسی لئے ان کے کلام کے مصور ایڈیشن کو غالب کے مصور ایڈیشن سے بہت ہی مختلف ہونا چاہئے تھا، مگر آرٹ کی باتیں آرٹ کے ماہرین ہی جان سکتے ہیں۔ ایک عامی کی اندرونی خواہش کا اس میں دخل انداز ہونا مناسب نہیں، چنانچہ ان کی مصوری پر جو نثری تبصرے ہیں، ان میں ان کے آرٹ کی داد خوب

دی گئی ہے، جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

"چغتائی اگر ہندوستان میں جدید ہندوستانی آرٹ کا نمائندہ تھا تو پاکستان میں وہ پورے مشرق کا نمائندہ ہے ...... چغتائی ان فن کاروں کے گروہ سے ہے جنھوں نے ساحل سے بے نیاز ہو کر گرداب کی متلاطم موجوں سے کھیل کر ساحل کا لطف اٹھایا ہے ...... چغتائی محض جدید نگارش کا ہی علم بردار نہیں، وہ نئی تکنیک کے تجربوں کا فنکار ہے، اس نے دورِ احیاء کے عظیم فن کاروں، مغل اور ایرانی استادوں سے بھی استفادہ کیا ہے، اس نے مجرد اور تجریدی آرٹ کا بھی مطالعہ جی بھر کر کیا ہے، اس نے اجنتا کی انفرادیت کو خوب سمجھا ہے، اس کے شاہکاروں میں مشرقی مصوری کے ہر دور کی جھلک نظر آتی ہے، اس کی انتقاد اور بیداری میں زندگی کا وہ سوز و ساز موجود ہے جس سے اس کے معاشرے کی نگہداشت ہوتی ہے"

اس قسم کی اور بھی مدح و ستائش ہے، ان نثری تحریروں کے لکھنے والے کا نام درج نہیں، اس لئے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ خراج عقیدت کس کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے؟

یہ کتاب جس عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئی، اس پر اردو کی کتابت و طباعت کو ناز ہو سکتا ہے، جس کتب خانہ میں یہ کتاب نہ ہوگی اس میں بڑی کمی محسوس کی جائے گی۔

ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور کے ہم بے حد ممنون ہیں کہ اس کی طرف سے اس کی گراں قدر مطبوعات کا ایک سٹ ملا جس سے دار المصنفین کے کتب خانہ میں بڑا مفید اضافہ ہوگیا ہے، یہ مطبوعات حسب ذیل ہیں:

(۱) **کلیات فیضی**: اس کو اے، ڈی ارشد ایم، اے، پی، اچ، ڈی نے ایڈٹ کیا ہے، ارشد صاحب کے نام کے ساتھ اے، ڈی، سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں انگریزی زبان سے مرعوبیت اب بھی باقی ہے جو ذوق سلیم کی دلیل نہیں، اس کتاب پر جناب سید وزیر الحسن عابدی نے

نظر ثانی کی ہے جو اس وقت پاکستان میں فارسی شعر و ادب پر بڑی اچھی نظر رکھنے والے سمجھے جاتے ہیں، ایک مختصر سا پیش لفظ جناب ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کا ہے جو اس وقت ادارہ تحقیقات پاکستان کی مجلس انتظامیہ کے صدر تھے، پھر ایک مقدمہ اے، ڈی، ارشد صاحب کا ہے جس سے کلیات فیضی کے ان قلمی مخطوطات سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں جو مرتب کو اس برصغیر کے مختلف کتبخانوں میں حاصل ہوئے، انھیں کو سامنے رکھ کر انھوں نے یہ کلیات مرتب کیا ہے، جس میں فیضی کے قصائد ترکیب بند اور غزلیات وغیرہ کے اشعار کی تعداد بارہ ہزار تک پہونچ گئی ہے، فیضی ہندوستان کے ان فارسی شعراء میں ہے جو امیر خسرو کے بعد صاحب فطرت، صاحب مہارت اور جمیع علوم و اقسام سخن کا بے مثال شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ جوش بیان کا موجد اور خاتم سمجھا جاتا ہے، شاعری اس کے قلم کو سجدہ کرتی رہی، مگر افسوس اس کا تھا کہ اس کے کلام کا کوئی مجموعہ طبع نہیں ہوا، اس کی تلافی ۱۹۶۷ء میں زیر نظر کلیات کی طباعت سے ہوئی، جس کے لئے ارباب ذوق جناب اے، ڈی ارشد اور پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تحقیقات پاکستان دونوں کے ممنون ہیں، اس کی اشاعت سے فیضی کے کلام کو سمجھنے اور پرکھنے میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے، اس میں جناب اے، ڈی، ارشد کے مقدمہ سے بعض مفید باتیں تو ضرور معلوم ہوتی ہیں لیکن فیضی جیسے شاعر کے کلام پر اس میں وہ سیر حاصل تبصرہ نہیں جس کا وہ مستحق ہے، فیضی کے ناقد معاصر ملا عبد القادر بدایونی نے اس کے متعلق جو سخت رائے ظاہر کی ہے وہ ان کے مقدمہ کا دلچسپ موضوع ہو سکتا تھا، اس کو انھوں نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے، شعر و ادب میں اس کا جو مقام ہے اس کی بھی صحیح تصویر اس مقدمہ سے سامنے نہیں آتی ہے۔

(۲) **رقعات حکیم ابو الفتح گیلانی**: حکیم ابو الفتح گیلانی اکبری دربار کی ان اہم شخصیتوں میں تھا جنھوں نے اکبر کے مزاج میں بڑا دخل حاصل کر لیا تھا، اس کی زندگی میں سیاسی اور حسرکی

ہنگامہ آرائیاں تو نہیں رہیں لیکن وہ اپنے علمی اور ادبی ذوق کی وجہ سے بہت ممتاز رہا، اس نے اپنے یہاں
علم و فن کی بزم شاہانہ انداز میں گرم رکھی تھی جو بقول مولانا شبلی اس زمانہ کی بیت الحکمت تھی، اسی میں خواجہ
حسین ثنائی، مرزا قلی میلی، عرفی، شیرازی اور حیاتی گیلانی وغیرہ نے تربیت پائی، مآثر رحیمی کے مصنف کا
بیان ہے کہ اس نے اکبر کے مزاج میں اتنا دخل حاصل کر لیا تھا کہ جعفر برمکی کو بھی ہارون رشید کے مزاج
میں اتنا دخل نہ ہوا ہوگا، ابوالفضل اور فیضی دونوں اس کی خوبیوں کے معترف رہے، ابوالفضل نے
اس کی وفات پر لکھا تھا کہ اخلاص، مزاج شناسی، خیر اندیشی عام، فصاحت زبان، حسن منظر اداے
فطری حکمت، ذاتی گرم جوشی اور عقل و دانش ایک شخص میں کم جمع ہوئی ہوگی، عرفی جیسا خود دار،
خود شناس اور خود بیں شاعر بھی اس کا مداح رہا، اور بقول مولانا شبلی اس نے جس زور کے قصیدے
اس کی شان میں لکھے، اکبر اور عبدالرحیم خانخاناں کی مدح میں نہیں لکھے، اسی یگانہ روزگار کے
مکتوبات کے مجموعہ کو پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کر کے ایک بڑی علمی خدمت انجام دی،
اس کو ایڈٹ ڈاکٹر بشیر حسین نے کیا، جنھوں نے شروع میں ایک پر مغز مقدمہ لکھ کر حکیم ابوالفتح گیلانی
کے حالات، علم و فضل، تصانیف اور اولاد وغیرہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی ہیں
اس سے عہد مغلیہ کی ایک اہم شخصیت کی ایک اچھی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، ملا عبدالقادر بدایونی
اس کے معاصر تھے، وہ اس سے اس لئے خوش نہ تھے کہ اس نے فیضی اور ابوالفضل کی طرح
اکبر کے مذہبی خیالات کا ساتھ دیا، وہ لکھتے ہیں کہ وہ اپنی بے دینی اور تمام اخلاق ذمیمہ میں ضرب المثل
تھا، ڈاکٹر محمد بشیر حسین کو ملا عبدالقادر بدایونی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے، اس لئے انھوں نے
حکیم ابوالفتح کے رقعات سے اس کی انسان دوستی، غریبوں سے محبت، آداب محفل سے آگاہی، وفاداری
وفا شعاری، نیک طینتی، خدا کے خالق و رازق ہونے پر ایمان، احادیث نبوی پر اعتقاد، زندگی کے
آخری حصہ میں رفیق الاعلیٰ سے متعلق بہت کچھ مواد جمع کر کے ملا بدایونی کے الزامات کی تردید کی ہے،

ملا بدایونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انوری کو انوریک مداح کہہ کر اس کی تضحیک کیا کرتا تھا، اس کی
بھی انھوں نے تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ انوری کا قدردان اور معترف تھا، لیکن یہ ایک
حقیقت ہے کہ اس نے ابوالفضل کی طرح اکبر کی بے دینی کا ساتھ دیا، اس کے بغیر وہ اپنے شاہی آقا
کے مزاج میں دخیل نہیں ہو سکتا تھا، یہ اور بات ہے کہ وہ ابوالفضل ہی کی طرح خلوت میں آ کر کچھ
اور ہو جاتا ہو، حکیم ابوالفتح گیلانی کے مذہب کے ذکر میں اس زمانہ کے سرکاری مذہب دین الٰہی کا
ذکر آنا چاہئے تھا، مگر لائق مصحح نے اس زمانہ کی اس مذہبی فضا کو بالکل نظر انداز کر دیا، شاید اس لئے کہ
اس بحث میں پڑ جاتے تو حکیم ابوالفتح گیلانی کو مجروح ہونے سے بچا نہیں سکتے تھے، اس سے قطع نظر
حکیم ابوالفتح گیلانی کے رقعات کے مجموعہ کی طباعت سے نہ صرف اس کے حالات و کردار سے متعلق
مفید معلومات حاصل ہوں گے، بلکہ یہ اس زمانہ کے بہت کچھ تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی باتوں کا
مستند ماخذ بن جائے گا، محمد حسین آزاد نے اس کے رقعات کے مجموعہ چہار باغ کے متعلق لکھا ہے
کہ ان کی انشاء پردازی دیکھنی چاہو تو چہار باغ دیکھو، خیالات شاعرانہ میں فلسفہ و حکمت کے
پھول برس رہے ہیں اور یہ گل افشانی جمع خرچ زبانی نہیں، اس کی انشا پردازی، فلسفہ و حکمت
اور گل افشانی کی لذت اٹھانے کا موقع اس کی اشاعت و طباعت سے ملے گا، کاش حکیم ابوالفتح
گیلانی کی اور تصانیف بھی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہو جاتیں، کیونکہ اس کی تصنیف
فتاحی کے متعلق محمد حسین آزاد نے لکھا ہے، فتاحی دیکھو شیخ بوعلی سینا کی روح کو آب حیات
پلایا ہے، اس کی دوسری تصنیف قیاسیہ کو دیکھو حکمت و شریعت کا یہ عالم ہے کہ شربت و شیر
کی دو نہریں بہی جاتی ہیں، قیاسیہ کی اشاعت سے اس کے مذہبی خیالات کو شاید صحیح طور سے
جانچنے کا موقع مل جائے۔

مکتوبات سعد اللہ خاں، علامی سعد اللہ نے شاہجہاں کے دور میں بڑا عروج حاصل کیا

ترقی کرکے وزیر کل ہوئے۔ وہ اپنی فکر کی اصابت، ذہن کی رسائی، معلومات کی وسعت اور معاملات کے تدبر کے لئے بے مثل سمجھے جاتے تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں ان کو جو دسترس تھی اس بنیاد پر بادشاہ نامہ کا مؤلف عبدالحمید لاہوری ان کو علامۃ الوری اور فہامۃ العصر لکھتا ہے۔ ان ہی کے مکتوبات کا یہ مجموعہ پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ ان مکتوبات کی تصحیح تو ڈاکٹر ناظر حسن زیدی نے کی ہے لیکن اس کی نظر ثانی کرکے مولانا غلام رسول مہر نے جو اس کے شروع میں مقدمہ لکھا ہے اور اس کے آخر میں جو تعلیقات کا اضافہ کیا ہے، اس سے یہ کتاب نہ صرف باوزن ہوگئی ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے شاہجہانی عہد کی تاریخ کا ایک مفید لٹریچر میسر آگیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کا نام اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کے مقدمہ میں ان کے قلم کی موشگافی، تحریر کی شگفتگی اور تحقیق کی دیدہ ریزی ہوگی۔ علامی سعد اللہ خاں کے حالات ایک جگہ مآثر الامراء کی جلد دوم میں سات آٹھ صفحوں میں ملتے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کو اپنے مقدمہ میں ماخذ ضرور بنایا ہے لیکن اپنے ۲۲ صفحے کی تحریر اور تحقیق میں علامی سعد اللہ خاں کے متعلق جو کچھ لکھ دیا ہے، آئندہ ان ہی کے ایجاز کا اطناب ہوا کرے گا۔ مولانا مہر نے اپنے مقدمہ میں علامی سعد اللہ خاں کے حالات کے سلسلہ میں بعض مفید باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ علامی سعد اللہ خاں اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں شاہی خزانہ کی رقم خرچ کرنے میں بہت محتاط بلکہ جزرس تھے، ان کی دینداری کی وجہ سے شاہی ملازمین بھی متدین ہوگئے تھے، اس لئے ایک موقع پر رعایا کے ایک فرد نے شاہجہاں کو مخاطب کرکے کہا کہ اس مبارک زمانہ میں جملہ نیکیاں جمع ہوگئی ہیں۔ بادشاہ عادل، وزیر اعظم جزرس، اہل کار متدین، خلق خدا مرفہ الحال۔ ان عطیات ایزدی کا شکر واجب ہے۔ شاہجہاں نے یہ سن کر بارگاہ باری تعالیٰ میں فریضۂ شکر ادا کیا۔ علامی سعد اللہ خاں کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا

"مصالح بقدر خواہش و خواہش بقدر جوہر پاک بہم می رسد۔"

یعنی نیکیوں اور اچھائیوں کی جتنی خواہش انسان کو ہو پوری ہو جاتی ہیں، مگر ایسی خواہش کا انحصار انسانی جوہر کی پاکیزگی یعنی طبیعت اور قصد و نیت کی صفائی پر موقوف ہے۔ علامی سعد اللہ خاں کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ وزارت کے فرائض اپنے انسانی جوہر کی پاکیزگی اور اپنی نیت کی صفائی سے انجام دیتے رہے، اسی لئے ایک موقع پر انھوں نے شاہجہاں کی توجہ اس طرف دلائی کہ (۱) سلطنت کی بنیاد عدل پر قائم ہے (۲) ملک و مال میں افزائش شجاعت و سخاوت سے ہوتی ہے (۳) علماء، فضلاء کی ہم نشینی اور جاہلوں کے قرب سے پرہیز عقل و دانش کا نشان ہے (۴) اپنے معتقدات پر کاربند رہنا چاہئے۔ شدتوں اور سختیوں میں بھی رشتۂ استقلال ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے (۵) دنیوی امور کے متعلق مناسب تدبیریں اختیار کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے، تاہم سعی و کوشش کے باوصف جو صورت حال پیش آجائے اس کو مقدر سمجھتے ہوئے شکر گذار رہنا لازم ہے (۶) خاندان کی دیرپائی، یتیموں کے لئے رحم و کرم پر موقوف ہے، یہ بھی جان لینا چاہئے کہ حاجت مندوں کی ضرورتیں اس طرح پوری کرنی چاہئیں کہ انسان خود محتاج نہ ہو جائے (۷) امور ملکی کا انصرام وزیروں کے مشورے اور صوابدید سے ہو (۸) نصرت و ظفر خدا کے پاک بندوں سے طلب ہمت پر موقوف ہے (۹) تندرستی کی آرزو اس بنا پر کی جائے کہ مصیبت زدوں کے دکھ درد کا ازالہ کیا جا سکے (۱۰) مجرموں کے جرائم پر خط عفو کھینچ کر خدا سے رحمت کی امید رکھنی چاہئے۔

مولانا مہر نے علامی سعد اللہ خاں کے حوالہ سے یہ تمام باتیں قلمبند کرکے مغلوں کے دور کے اصول حکومت کو متعین کرنے میں بڑا اچھا مواد فراہم کر دیا ہے۔ یہ راقم اپنے مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ بابر سے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک تیموری فرماں روا ان ہی اصولوں کے پابند ہو کر حکومت کرتے رہے۔ اسی لئے فتح و کامرانی ان کے قدموں کو چومتی رہی۔

اس مجموعہ کے ہر مکتوب سے متعلق اس کے شروع میں مفید نوٹ دے دیئے گئے ہیں، جس سے ہر مکتوب کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مجموعہ کو ایڈٹ کرنے میں محنت سے کام لیا گیا ہے۔ آخر میں تعلیقات بھی کاوش سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ مگر یہ بات کھٹکی کہ راجہ روپ سنگھ راٹھور اور راؤ ستر سال ہاڈا کے حالات معاصر تاریخوں میں سے عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری اور مآثر الامراء جیسی مستند کتابوں میں مل سکتے تھے، تو ان کے حالات قلمبند کرنے میں نجم الغنی رام پوری کی کتاب کارنامۂ راجپوتاں کا سہارا لینے کی ضرورت نہ تھی۔

آداب عالمگیری: اس میں زیادہ تر اورنگ زیب عالمگیر کے جلوس ثانی کے زمانہ تک کے خطوط ہیں جو اس نے یا تو خود لکھے یا لکھوائے اس کا میر منشی منشی الممالک شیخ ابوالفتح المخاطب بہ قابل خان تھا، جو اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ سے اس کے بادشاہ بننے کے دوسرے سال تک اس کی ملازمت میں رہا۔ وہ ٹھٹھہ کا رہنے والا تھا، اورنگ زیب اس سے بھی خطوط لکھوایا کرتا تھا، ان خطوط کے جو مسودات اس کے پاس تھے ان کو اس کی وفات کے بعد محمد صادق مطلبی (المتوفی ۱۱۲۹ھ) نے مرتب کیا، جو امبالہ کا رہنے والا تھا، وہ اورنگ زیب کے چھوٹے بیٹے شہزادہ اکبر کا میر منشی تھا۔ اس نے قابل خان کے مسودات کو مرتب کرتے وقت ان میں ان مراسلات کا بھی اضافہ کر دیا جو اس نے شہزادہ اکبر کی طرف سے اورنگ زیب عالمگیر اور اراکین سلطنت کو لکھے تھے۔ اس نے اورنگ زیب کی حکومت کے دو سال کی تاریخ بھی عمل صالح اور دوسری تاریخوں سے ماخوذ کر کے اس میں شامل کر دیا ہے اسی کی دو جلدوں کو جناب عبدالغفور چودھری صاحب نے ایڈٹ کیا ہے۔ انھوں نے اس کو

ترتیب دیتے وقت صرف اس نسخہ کو سامنے رکھا ہے جو پبلک لائبریری لاہور میں تھا، حالانکہ سلسلہ دارالمصنفین میں جناب سید نجیب اشرف ندوی صاحب کی کتاب مقدمۂ رقعات عالمگیر میں اس کے گیارہ نسخوں کی نشاندہی کر دی گئی تھی جو لاہور کے علاوہ لندن، کلکتہ، پٹنہ، اعظم گڈھ، آگرہ اور رام پور کے کتب خانوں میں موجود ہیں، معلوم نہیں مصحح نے ان نسخوں کی طرف رجوع کرنے کی تکلیف کیوں گوارا نہیں کی، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں اس کا ایک بہت اچھا نسخہ موجود ہے جو بڑی تقطیع کے ۶۹۵ صفحے پر مشتمل ہے۔ پھر بھی لائق مصحح کی یہ علمی سعی قابل داد ہے کہ ان کی وجہ سے یہ دو مجموعے شائع تو ہو گئے اس کے مقدمہ میں قابل خان اور صادق مطلبی کے حالات سے متعلق مفید معلومات فراہم کر دیئے گئے ہیں، پنجاب یونیورسٹی کی شائع کردہ اور مجموعۂ مکتوبات کی طرح اس کے ہر مکتوب کے شروع میں اردو میں اچھے نوٹ دے دیئے گئے ہیں، جس سے تمام خطوط کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مصحح نے ایڈٹ کرتے وقت ہر خط کا مطالعہ پورے طور پر کیا ہے، یہ دونوں جلدیں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھیں معلوم نہیں اس کی اور جلدیں بھی شائع ہوگئی کہ نہیں، دارالمصنفین میں اس کا جو ضخیم نسخہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ چھپ کر کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ تمام جلدیں شائع ہو گئیں تو ایک بہت مفید علمی خدمت انجام پا جائے گی۔

احکام عالمگیری، کلمات طیبات، رقائم کرائم، دستور العمل آگہی اور رموز واشارات عالمگیری وغیرہ میں بھی اورنگ زیب کے خطوط ہیں۔ اگر ان کو بھی ایڈٹ کر کے شائع کر دیا جائے تو ان کے گہرے مطالعہ سے اورنگ زیب سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں

(باقی)

استدراک

از

مولانا محمد ازہر شاہ قیصر ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم (دیوبند)

افسوس ہے کہ مولانا محمد ازہر شاہ قیصر کا یہ خط ڈاک میں ادھر ادھر ہوگیا تھا اب کئی ماہ کے بعد ملا تو یہ شائع کیا جارہا ہے ع ق

معارف کے ایک نمبر میں مولانا یوسف نیوری کے متعلق آپ کا مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی، دیوبند کے قدیم حالات پر آپ کی نظر ہے، اور آپ نے بڑی وسعت قلبی کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے، اس مضمون میں ایک ذرا سا تسامح رہ گیا ہے، ڈابھیل میں مجلس علمی مولانا یوسف نیوری نے نہیں بلکہ خود حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قائم فرمائی تھی، اور اپنے اس وقت کے نوجوان شاگردوں مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد یحیٰی تھانوی وغیرہ کو تصنیف و تالیف کے کام پر لگایا تھا، مولانا محمد یوسف نیوری ڈابھیل میں دورۂ حدیث پڑھ کر اپنے وطن جاچکے تھے، ڈابھیل میں بہ سلسلۂ تدریس و تصنیف اباجی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد پہونچے اور پھر انھوں نے مجلس علمی کی بڑی خدمت کی ہے، عجیب بات یہ ہے کہ نیوری صاحب کو اباجی رحمۃ اللہ علیہ سے قریب رہنے کا موقع بہت کم ملا، جن کی ابتدا یہ ہے کہ ۱۸ برس کی عمر میں وہ مشکوٰۃ و جلالین کے طالب علم کی حیثیت سے دیوبند آئے، ان کے والد مولانا محمد زکریا صاحب اور ماموں مولانا فضل صمدانی سے اباجی رحمۃ اللہ علیہ

مگر نیوری صاحب نے بغیر کسی تعارف کے اپنا ایک عربی قصیدہ اباجیؒ کے
کے تعلقات تھے،
جسے ملاحظہ فرماکر اباجی نے فرمایا کہ اس میں کسی اصلاح کی ضرورت نہیں،
سامنے پیش کیا،
صاحب بہت تھوڑی مدت میں اباجی سے قریب ہوگئے، علاوہ عام درس کے کئی کتابیں
نیوری
ان کو اباجی نے پڑھایا، لیکن اباجی سے ان کی معیت اور صحبت کی مدت بہت کم
صرف
مگر اس بہت کم مدت میں انھوں نے اباجی کو خوب سمجھا، اور ان کے علوم کی بڑی خدمت
ہے
کی آپ نے مولانا سید محمد طلحہ کا بھی ذکر کیا ہے، میں نے اپنے بچپن میں مولانا طلحہ صاحب کو
اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں میں لاہور اور دیوبند میں دیکھا ہے،

آپ نے یہ خبر کسی اخبار میں پڑھی ہوگی کہ حکومت جموں و کشمیر نے ابھی اکتوبر میں اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک سمینار کشمیر میں بلایا تھا جس میں ان کے خاص شاگرد جمع ہوئے تھے، یہ سمینار بہت کامیاب رہا اور اس میں شیخ محمد عبداللہ صاحب نے کشمیر میں اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک علمی ادارہ قائم کرنے کی تجویز منظور کی، عزیز مکرم مولانا محمد فاروق، میرواعظ کشمیری، مولانا مسعودی، مولانا محمد طیب صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا سعید احمد صاحب اس تجویز کے محرک تھے،

معارف کو اپنے صفحات پر اس تجویز کی تائید کرنی چاہئے اور اس کے قیام پر زور دینا چاہئے، کشمیر میں علمی دینی کام کرنے کا بڑا میدان ہے، اب شیخ صاحب بھی متوجہ ہیں، ایسا علمی دینی اور تصنیفی ادارہ قائم ہوگیا تو بڑا کام ہوگا،

وفیات

آہ! ڈاکٹر ظفر الہدیٰ

سید صباح الدین عبدالرحمن

ڈاکٹر ظفر الہدیٰ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، علامہ شبلیؒ کی بڑی پوتی کے شوہر تھے، ان کا آبائی وطن تو اعظم گڈھ ضلع ہی میں تھا، مگر ان کے گھر کے لوگ دربھنگہ (بہار) منتقل ہو گئے تھے، اس لئے پٹنہ یونیورسٹی میں اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کی، وہاں سے فارسی اور اردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں لکچرار ہو گئے، وہیں سے پنشن پاکر ڈھاکہ میں مقیم تھے کہ ۲ مارچ ۱۹۰۰ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، ان کی وفات علامہ شبلیؒ کے خاندان کا ایک المناک سانحہ ہے، وہ اپنے شاگردوں اور یونیورسٹی کے رفقائے کار میں اپنے اخلاق، اخلاص، محبت اور میٹھی زبان کی وجہ سے بہت مقبول تھے، اسی لئے جب بنگلہ دیش میں خونین انقلاب آیا تو وہاں کی سفاکانہ اور بیرحمانہ خونریزی میں ہر طرح محفوظ رہے، ان کے اور رفقائے کار تو کراچی منتقل ہو گئے، لیکن انھوں نے ڈھاکہ ہی میں رہنا پسند کیا، بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کے ساتھ جو بے رحمانہ سلوک کیا تھا، اس کی وجہ سے بنگلہ دیش کے لوگوں کے خلاف ہندستان کے مسلمانوں میں بڑا سخت رد عمل تھا، اس کو ڈاکٹر ظفر الہدیٰ اپنے خطوط میں یہ لکھ کر دور کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ آخر یہ لوگ بھی مسلمان ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا صالح لٹریچر پیش کرنے کی خاطر شبلی اکیڈمی بھی قائم کی، دار المصنفین کی مطبوعات کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کرانے کی علمی مہم شروع کی، ان کا کام کچھ چل نکلا تھا کہ وہ وہاں پہونچ گئے، جہاں ایک روز سب کو جانا ہے۔

ان کو دار المصنفین اور اس کے وسیلہ سے میری حقیر ذات سے بڑی محبت رہی، میں جب کبھی ڈھاکہ گیا تو وہ مجھ سے سگے بھائی کی طرح ملتے، اور خاطر و تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اعظم گڈھ آتے تو ان کا زیادہ تر وقت دار المصنفین ہی میں گذرتا، یہیں قیام کرکے انھوں نے اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا، جس کا عنوان یہ تھا، ہندوستان میں [illegible] سے [illegible] تک کے عہد میں فارسی زبان و ادب کا فروغ" ان کے اس مقالہ کے کچھ حصے کراچی کی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سہ ماہی انگریزی جرنل اور معارف میں چھپے، اور اس کی داد ان کو اہل نظر سے ملی، ان کے پورے مقالہ کا اردو ترجمہ ان کے ایک شاگرد سلطان احمد صاحب نے کیا ہے، امید کہ یہ ترجمہ دار المصنفین سے شایع ہوگا، ان کی اہلیہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرکے وہیں پریکٹس کرتی ہیں، انکی اولاد میں صرف ایک لڑکی ہے، وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے، لیکن اپنی شرافت، اخلاق، بلند ہمت، دوست نوازی، اعزہ پروری، اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے ایک عرصہ دراز تک اپنے عزیزوں اور دوستوں کے حلقے میں یاد کئے جائیں گے، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو انکی نیکیوں کی بدولت ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں، آمین، ثم آمین۔

اعجاز صدیقی مرحوم

از۔ جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی

مولانا سیماب اکبر آبادی کے فرزند اور رسالہ "شاعر" کے مدیر، اعجاز صدیقی پر ۹ فروری ۱۹۷۸ء کو دل کا دورہ پڑا، اور وہ اسی روز اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ایک عرصہ سے مختلف امراض کی وجہ سے اعجاز صاحب کی صحت خراب ہو چکی تھی، کئی بار اسپتال میں داخل کیے گئے، اچھے اچھے ڈاکٹروں نے بڑی توجہ اور شفقت سے علاج کیا، مگر بقول شاعر

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا، اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اعجاز صدیقی فروری ۱۹۵۱ء میں اپنے وطن آگرہ سے بمبئی آئے اور یہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کا رسالہ "شاعر" (ماہنامہ) جو پہلے آگرے سے نکلتا تھا، اسی سال سے بمبئی سے شائع ہونے لگا، وہ اس کے معیار کو بلند رکھنے میں انتھک کوشش کرتے تھے، اردو سے پُرخلوص محبت اور اپنے قارئین کو صاف ستھرا ادب پیش کرنے کی کوشش، ان کی زندگی کے دو ایسے نمایاں پہلو تھے کہ جن کی وجہ سے اردو کے اچھے اور اہم لکھنے والوں اور شعراء کا انھیں غیر معمولی تعاون حاصل ہوتا رہا، جس کے سہارے وہ "شاعر" کے بڑے ضخیم خصوصی نمبر نکال سکے، ان میں کرشن چندر نمبر، ناولٹ نمبر، افسانہ اور ڈراما نمبر اور آخر میں، ہم عصر اردو ادب نمبر، ہماری زبان و ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلسل علالت، گرتی ہوئی صحت اور محدود وسائل کے ساتھ ایسے ضخیم اور اچھے نمبر شائع کرنا، بڑی جرأت کا کام تھا، بلاشبہ اعجاز صاحب غیر معمولی قوت ارادی کے حامل تھے!

اعجاز صدیقی، ذاتی طور پر مشرقی تہذیب اور قدروں کے علمبردار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے، انھوں نے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات اور دوستانہ مراسم سالہا سال تک آخری دم تک، بڑی خوبی کے ساتھ نبھائے، بمبئی، فلمی دنیا کا مرکز مانا جاتا ہے، جہاں پہنچ کر اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں (یا جدید اصطلاح میں قلمکاروں) کا ادبی پرہیز ٹوٹ جاتا ہے مگر اعجاز صاحب نے سب سے تعلقات رکھتے ہوئے بھی، اپنے قلم کی سلامت روی کو قائم رکھا

اردو تحریک اور اس سے متعلقہ مسائل، اعجاز صاحب کے دماغ پر ہر لمحہ اس طرح چھائے

رہتے تھے کہ ان سے کسی اور موضوع پر گفتگو کم ہوتی تھی، انھوں نے "جرعات" کے تحت "شاعر" میں ان مسائل پر اچھے اداریے لکھے ہیں جن میں فکر کی گہرائی، اور خلوص کا جذبہ، دونوں جھلکتے ہیں، وہ غزل کے شاعر تھے، مشاعروں میں اسوقت بھی مقبول رہے، جب ترنم سے پڑھتے تھے، اور اسوقت بھی دادِ سخن حاصل کرتے رہے جب ترنم سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا، انھوں نے کئی قومی نظمیں لکھیں مثلاً "خوابوں کا مسیحا، ہماری جنگ آزادی، ہم امن چاہتے ہیں" وغیرہ ان میں سے بعض پر ادبی اداروں کی طرف سے انعامات بھی ملے۔

اعجاز صدیقی کی وفات سے اردو کی صف سے ایک مخلص، سچا اور جانباز سپاہی اٹھ گیا، اللہ اُن کی مغفرت فرمائے،

حیاتِ سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی . . . . سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی علمی و ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً "ہنگامہ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دار المصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، نیز مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کی طرح ہے، ویسی ہی دلکش، اور دلچسپ،

مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ قیمت ۲۵ روپے ۵۰ پیسے — منیجر

باب التقریظ والانتقاد

"جامِ شعور"

جناب سید اطہر حسین صاحب، آئی۔اے۔ایس، لکھنؤ کے حلقہ میں اس حیثیت سے جانے، اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں کہ وہ ایک لائق اور دیانت دار اعلیٰ عہدیدار ہیں، اور اپنی ملازمت کی گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود انگریزی اور اردو میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اچھے مضامین اور اچھی کتابیں لکھ کر اپنی علمی صلاحیت اور مذہبیت کا اظہار کرتے رہتے ہیں، مگر کوئی اُن سے شاعر کی حیثیت سے واقف نہیں تھا، ۱۹۷۷ء میں جب ان کی عمر تقریباً ۶۵ سال کی ہوئی، تو یکایک اُن کے کلام کا ایک مجموعہ جامِ شعور کے نام سے شائع ہوا، تو ان کے دوستوں اور قریبی تعلق رکھنے والوں کو بھی یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ وہ شاعر بھی ہیں اور ایک اچھے شاعر،

اُن کی شاعری کی ابتدا غالباً اُن کی رفیقۂ حیات کی غمناک وفات سے ہوئی، اس سانحہ سے اُن کے تحت الشعور میں جو شاعرانہ جذبات دبے ہوئے تھے، وہ یکایک اُبھر آئے، اُن کے اشکِ مسلسل سے موتی کی لڑی تیار ہونے لگی، اور وہ جب کچھ اپنی شاعری میں کہنے لگے، جو اُن کے دل پر پڑی تھی، کچھ اشعار تو انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات کی یاد میں کہے، مگر ان کی دائمی جدائی کی کھٹک اور کسک اُنکی غزلوں میں بھی منتقل ہوگئی ہے،

صحنِ گلشن میں کھِلے ہیں جو یہی لالہ و گل
چند رنگین و حسین لمحوں کے مہماں ہوں گے

حیات و موت اگر ہمکنار ہیں ہمدم
مٹے ہیں لوگ یہ کیوں ایسی زندگی کے لئے

رضا کی بات اگر ہو تو کیا خوشی اپنی
خدایا تلخیِ غم کردے سازگار مجھے

ان کا ذوق مذہبی ہے، اس لئے جہاں معرفتِ نفس میں یہ کہہ گئے ہیں،

مقصد ترا لافانی پرواز ہے لاہوتی
شہ کار خداوندی یہ ضعف بشر کیا ہے

کیا معجزہ قدرتِ اللہ نے دکھلایا
کم مایہ سہی لیکن، تقدیر بشر کیا ہے

وہاں معرفتِ حق میں ان کے یہاں یہ اشعار ملیں گے،

معرفتِ جمال کو چاہئے فکرِ دیدہ ور
سابقہ حیرتوں سے ہے حد نگاہ تک مگر

یہ تو مقامِ عشق ہے منزلِ جذب و کیف ہے
جوشِ جنوں سے واسطہ اہلِ خرد سے درگزر

پھر اسی جذبہ میں جو حمد لکھی ہے، وہ اُن کے رچے ہوئے مذہبی ذوق کا ثبوت ہے،

نور ہی نور کو بہ کو نغمۂ حمد چارسو
اس کی ضیائے حسن سے بزمِ جہاں سنور گئی

اس کا کرم ہے بیکراں بخششیں اسکی بے شمار
دیکھ کے اپنی غفلتیں آج تو آنکھ بھر گئی

پھر ان کی مناجات کا ایک شعر ہے،

وہ سوز دے ملتا ہے جو آشفتہ دلوں کو
ہر غم سے زمانہ کے جو بیگانہ بنا دے

پھر اپنی ایک غزل میں یہ کہتے ہیں:

یہ مصائبِ دلِ پُر محن نہ بدل سکیں گے مرا چلن،
کہ مری محافظِ جان و تن تری ذات ربِّ غفور ہے

انھوں نے ایک نعت بھی لکھی، جو پرانٹ محمد، دی بینی فیکٹر آف مین کا مصنف دی میسیج آف دی قرآن کا مصنف ہی لکھ سکتا ہے،

جس زبان اور طرز ادا میں سید طہر حسین صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اگر وہ سوداؔ اور اشرف علی فغاںؔ کے زمانہ میں ہوتے، تو ان کے معاصرین کہتے کہ ان کی شاعری میں بڑی شیوا بیانی اور مہارت ہے، مگر اب غزل گوئی کا فن اتنا آگے بڑھ گیا ہے، کہ ان کی غزلوں کی لے محض جانی پہچانی اور سمجھی بوجھی روایت ہی تصور کی جائے گی، لیکن ان کی خوش قسمتی ہے کہ اس دور کی شاعری کے ایک استاد جناب آنند نرائن ملا نے اُن کی شاعری کی داد یہ لکھ کر دی ہے کہ ایک فکر رسا، اور ایک دردمند دل دونوں نے مل کر انھیں یہ انداز بیان دیا ہے جس میں ان کا خلوص قدم قدم پر نمایاں ہے" یہ اُن کے لئے بہت بڑی سند ہے، امید ہے کہ جب انھوں نے اپنی شاعری کے رُخ زیبا سے نقاب اٹھایا ہے تو اس کے جلوۂ حسن کو آئندہ بھی نمایاں کرتے رہیں گے۔

ان کے اس مجموعہ کی لکھائی چھپائی بہت ہی عمدہ ہے، اس کی قیمت سولہ روپے ہے، اس کے ملنے کے پتے یہ ہیں،

(۱) گورنمنٹ نرسری کمپاؤنڈ مال روڈ لکھنؤ، اور نامی پریس نخاس، لکھنؤ،

"ص ع"

رسالوں کے اقبال نمبر

المعارف مرتبہ . مولانا محمد عبداللہ قریشی، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۴۴

اقبال نمبر قیمت سالانہ ۱۰ روپئے، پتہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور،

علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات ہندوستان اور پاکستان میں دھوم دھام سے منائی گئی ہیں، دہلی اور لاہور کے عالمی جشن کی روداد معارف کے گذشتہ شماروں میں چھپ چکی ہے اس موقع پر دونوں ملکوں کے رسائل کے خاص نمبروں میں بھی ڈاکٹر صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے مشہور علمی ماہنامہ "المعارف" کا اقبال نمبر

پیش نظر ہے، اس کی ابتدا خود ڈاکٹر صاحب کے ایک مضمون سے کی گئی ہے اس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ صرف اسلام کے نبیؐ برحق اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنے والوں ہی کو نہ کہ شہنشاہوں اور جمہوری فرمانرواؤں کو حکمرانی کا خداداد حق حاصل ہے، اس سلسلہ میں رسول اکرمؐ کے اوصاف وخصوصیات اور شہنشاہیت وجمہوریت کے خط وخال بھی دکھائے ہیں، پروفیسر محمد منور نے جہان اقبال کو جہان قرآن بتاتے ہوئے اس کی مثبت ومنفی خصوصیات تفصیل سے لکھی ہے، جناب شاہد حسین رزاقی نے غلط تصوف اور صوفیا کے خلاف اقبال کے خیالات پیش کئے ہیں اور لکھا ہے کہ وہ صحیح تصوف کے مخالف نہ تھے، رحیم بخش شاہین نے اقبال کا پسندیدہ معاشی نظام اسلامی نظام معیشت کو اور ناپسندیدہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی معاشی نظام کو بتایا ہے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے ایک طویل اخباری بیان کے اقتباسات نقل کرکے ان لوگوں کی بہت مدلل تردید کی ہے، جو ان کو اشتراکی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، دو مضامین میں اقبال کے نظریۂ تعلیم اور نظریۂ شعر کی وضاحت کی گئی ہے، ایک مضمون میں مغربی تہذیب پر ان کی تنقیدوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے، ایک مضمون مسئلہ فلسطین کے بارہ میں ان کے جذبات واحساسات پر مشتمل ہے، اس میں ترکی، عرب اور دوسرے اسلامی ملکوں کے ابتر حالات پر ان کے اضطراب وبے چینی کا ذکر بھی آگیا ہے، ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے، رسالہ کے لائق مدیر نے اس نیابت کے تمام معلومات اکٹھا کر دئے ہیں، آخری مضمون میں غازی علم الدین کا ذکر ہے ۱۹۲۷ء میں لاہور کے ایک ناشر راج پال نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نہایت گستاخانہ کتاب "رنگیلا رسول" شائع کی تھی، غازی علم الدین نے ان کو قتل کر دیا جس کے نتیجہ میں ان کو پھانسی دی گئی انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کو لاہور میں دفن کیا جائے،

مگر جیل کے حکام نے ان کو میانوالی میں نماز جنازہ کے بغیر دفن کر دیا اس سلسلہ میں ڈاکٹر موصوف اور دوسرے مسلم زعما کی ان کوششوں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے جن کی بدولت شہید کی نعش لاہور لائی گئی، یہ نمبر اقبال پر سنجیدہ اور باوزن مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مطالعہ کے لائق ہے اور اس سے بہت سی پر مغز اور مفید معلومات حاصل ہوں گی،

آج کل۔ مرتبہ شہباز حسین صاحب، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۵۲،
اقبال نمبر قیمت سالانہ دس روپئے، پتہ پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی،

یہ ہندوستان کے مشہور ماہنامہ "آج کل" کا اقبال نمبر ہے، اقبال کے عاشق اور پرستار جگن ناتھ آزاد کا مفید مصور مضمون "توقیت اقبال" ان کی کتاب "مرقع اقبال" سے ماخوذ ہے، جناب شبیر احمد خاں غوری نے تصور ملکیت و تقسیم دولت کے بارہ میں اقبال کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے، "اقبال اور عہد جدید" (ظہیر احمد صدیقی) "ایک شاگرد کے تاثرات" (صالحۃ الکبریٰ عرشی) اور دوسرے مضامین بھی اچھے ہیں، لیکن بعض مضامین میں اقبال کے افکار و خیالات کی صحیح ترجمانی نہیں کی گئی ہے، مثلاً خواجہ احمد عباس کا یہ دعویٰ کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح سوشلسٹ تھے، بالکل صحیح نہیں، بہت سے مضامین میں اس کی بہت مدلل تردید کی جا چکی ہے، فراق صاحب کے خیال میں اقبال نے دنیا کی مشکلات کا کوئی حل نہیں پیش کیا ہے، انھوں نے ان کے افکار کو کھوکھلا، گمراہ کن، اور متضاد بتایا ہے فراق صاحب غیر متوازن باتیں کہنے کے لئے مشہور رہیں، ان کی یہ بات بھی اسی کی نشاندہی کر رہی ہے

کلیم الدین صاحب کے مضمون "اقبال اور عالمی ادب" کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے کہ "اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں ہے"، وجہ یہ بتائی ہے کہ "ایسا مقام ہمارے آپ کے کہنے سے نہیں ملتا، یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب معیاری مغربی شعرا اور معیاری

مغربی نقاد اس کی بزرگی، اس کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہوں"، یہ وجہ وہی نقاد بتا سکتا ہو جس پر مغربی ادب کا کابوس سوار ہو، کلیم الدین صاحب پر یہ کابوس سوار ہے جب یہ کابوس ان پر سے اتر جائے گا تو وہ اقبال کے مرتبہ و مقام کو متعین کر سکیں گے، اور ان کے رتبہ کو بھی پہچان سکیں گے، اس کے بعد پھر شاید ان کی تنقیدوں کی ناہمواری بھی جاتی رہے گی اور بعض حلقہ میں ان کی تنقیدوں سے جو آزردگی پیدا ہو جایا کرتی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی،

ڈاکٹر قمر رئیس کے مضمون میں بھی بعض جگہ غیر معتدل باتیں ہیں، اقبال پر گوناگوں مفید کتابیں چھپ گئی ہیں، ان کے پیام، دعوت، اور افکار و خیالات کی تشریح پورے طور پر ہو گئی ہے، تعجب ہے کہ اس کے بعد بھی اقبال کے بارہ میں بے سروپا باتیں کہہ دی جاتی ہیں، نظموں کا حصہ اچھا ہے اس میں اقبال کی عظمت و کمالات کا اعتراف کیا گیا ہے، اس نمبر میں اقبال کی متعدد تصویریں بھی ہیں،

شیرازہ مرتبہ جناب رشید نازکی صاحب کاغذ وطباعت عمدہ، کتابت معمولی صفحات
اقبال نمبر ۲۰۰ قیمت تحریر نہیں پتہ۔ جموں اینڈ کشمیر اکاڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر،

یہ سہ ماہی رسالہ شیرازہ کا خاص نمبر ہے جو اقبال کے متعلق مضامین و منظومات پر مشتمل ہے اس میں ان سیمناروں میں پڑھے جانے والے بعض مضامین بھی شامل ہیں جو جموں اور سری نگر میں ہوئے تھے، اس کے مضامین میں اقبال کی زندگی، شخصیت اور فکر و فن کو زیر بحث لایا گیا ہے، شیخ حبیب اللہ کے مضمون میں ڈاکٹر تارا چند کے اس خیال کی تردید ہے کہ اقبال نے خیر و شر کا مسئلہ زرتشت کی تعلیمات سے لیا ہے، مکاتیب اقبال از مشعل سلطان پوری، اقبال اور حیدرآباد از قیصر سرمست، اقبال اور قرآن از زائم۔ اے شیدا، اچھے مضامین ہیں، جگن ناتھ آزاد کا مضمون "اقبال شاہ ہمدان کے حضور میں" ان کی زیر تسوید کتاب "اقبال اور کشمیر" کا ایک باب ہے، سب مضامین ایک سطح کے نہیں ہیں، ہنس راج رہبر کے مضمون میں بڑی ناہموار باتیں ہیں، جن کی تردید خود ادارہ کی طرف سے کی گئی ہے، منظومات کا حصہ اچھا ہے، یہ نمبر بھی مصور ہے، "ض"

مطبوعاتِ جدیدہ

پارسی گویان ہند و سند۔ ڈاکٹر ہرو مل سدا رنگانی متوسط تقطیع کاغذ عمدہ ٹائپ صفحات ... قیمت درج نہیں، مطبوعہ چاپ خانہ رامین۔ ایران،

ڈاکٹر ہرو مل سدا رنگانی نے بمبئی اور تہران کی یونیورسٹیوں سے کسب فیض کیا ہے، اس کتاب میں انھوں نے تیرھویں صدی تک کے ہند و سندھ کے فارسی شاعروں کا ذکر کیا ہے، یہ چار فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں پنجاب اور شمالی ہند کے بعض علاقوں میں فارسی زبان کے رواج پانے اور بعض ہندی اور سندھی شاعروں کا ذکر ہے، دوسری فصل میں نویں صدی ہجری سے قبل کے ہندوستان اور سندھ میں فارسی شاعری کی اجمالی تاریخ کے ساتھ چند فارسی گو شعرا کا تذکرہ بھی ہے، تیسری فصل میں مغلیہ سلطنت کے زمانہ کے ہندوستان میں فارسی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس عہد کے شعرا کے حالات تحریر کئے گئے ہیں، نیز سندھ کے ارغون، ترخان مغل اور کلہرہ فرماں رواؤں کے زمانہ کے فارسی گو شعرا کا ذکر بھی ہے، آخری فصل میں تیرھویں صدی ہجری تک کے بعض فارسی گو شعرا کے حالات ہیں، اس میں مرزا غالب اور لالہ امانت رائے وغیرہ کا بھی تذکرہ ہے، ہر فصل میں شعرا کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے، تیسری فصل زیادہ اہم ہے، کیونکہ دراصل یہی ہندوستان میں فارسی شاعری کا زریں عہد تھا، اس کے متعلق اردو میں اب کئی کتابیں چھپ گئی ہیں، دار المصنفین کی

کتاب بزم تیموریہ اسی دور کا ادبی مرقع ہے، اور اس سے پہلے کے دور کا ادبی مرقع بزم مملوکیہ ہے، مصنف نے عام شعرا کے علاوہ تیموری امراء و سلاطین کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا ہے، عرفی، فیضی، نظیری، ظہوری، طالب آملی، ابو طالب کلیم، سرمد، غنی کشمیری، فانی کشمیری، چندر بھان برہمن، صائب، محمد افضل سرخوش، عبد القادر بیدل اور علی حزین اور سندھ کے بغدادی کاشانی اور میر علی قانع وغیرہ سرآمد روزگار شعرا کا ذکر اسی فصل میں ہے، اور تاج الدین ریزہ شہاب الدین مہرہ، خواجہ عمید الدین، امیر خسرو اور امیر حسین دہلوی وغیرہ کا تذکرہ دوسری فصل میں ہے، اس کتاب میں فارسی شاعری کے مختلف دور کا بہت سرسری جائزہ لیا گیا ہے، اس لئے بڑی تشنگی معلوم ہوتی ہے، شاعروں کے حالات بھی اختصار سے لکھے گئے ہیں، اور کلام کا انتخاب اصل مآخذ اور دواوین کے بجائے عموماً تذکروں کی مدد سے کیا گیا ہے، اگر مصنف ہند و سندھ میں فارسی شاعری کے عہد بعہد ارتقا اور مختلف دور کا مزید تفصیل سے ذکر کرتے تو یہ کتاب ہندوستان کے فارسی شعر و ادب پر کام کرنے والوں کے لیے ایک اچھا ماخذ ہو جاتی، سندھ کے ایک شاعر محمد بن ابراہیم کے متعلق لکھا ہے "پیرو فرقہ نقشبندی بود" (ص ۲۰۶) حالانکہ نقشبندی کسی فرقہ کا نہیں بلکہ تصوف کے ایک سلسلہ کا نام ہے، بو الہوس کا املا بلہوس (ص ۱۰۴) لکھا ہے اور کتابت کی غلطی سے غلام علی کو غلا طعی ص ۱۵ اور غنی کشمیری کا سنہ وفات ۱۰۷۹ھ کے بجائے ۱۰۷۰ھ لکھ گیا ہے۔

خطباتِ ماجد۔ مرتبہ، جناب محمد صدیق صاحب دریابادی متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۱۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۔/۱۰ر

پتہ۔ ادارۂ انشائے ماجدی، ۱۴۱/۷ رابندر سرانی کلکتہ ۔ ۷۳،

جناب محمد صدیق دریابادی مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کے ہم وطن اور خاص عقیدت مند ہیں، انھوں نے اپنے صدیق لبیب اور مولانا کے ادب و انشا کے پرستار حاجی منظور علی لکھنوی کے اشتراک اور مالی تعاون سے کلکتہ میں "ادارہ انشائے ماجدی" کی داغ بیل ڈالی۔ جس کے اشاعتی پروگرام کی ابتدا زیر نظر کتاب سے کی گئی ہے، یہ مولانا کے چار خطبوں کا مجموعہ ہے، پہلا خطبہ بھتیجی اور آخری تین صاحبزادیوں کے عقد نکاح کے موقع پر لکھے گئے تھے، اور اسی زمانہ میں صدق میں چھپے تھے، ان میں نکاح کے مروجہ مسنون خطبہ کی آیتوں اور کلمات کی تشریح کرکے زوجین کے حقوق و فرائض، نکاح کا مقصد، ضرورت اور طریقہ وغیرہ بیان کیا گیا ہے، اور ضمناً اسلام میں عورت کی حیثیت و عظمت بھی بتائی گئی ہے، اور نکاح کو معیوب سمجھنے، اس کے موجودہ رائج طریقوں اور پسندیدہ شادیوں کی قباحتیں بھی دکھائی گئی ہیں یکسانیت اور تکرار کے باوجود یہ خطبے زوجین کے لئے ہدایت نامہ اور مولانا کے منفرد اور دلکش اسلوب تحریر کی خصوصیات سے معمور ہیں، اس لئے ان کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب ہے، کتاب کی ظاہری نفاست اور حسن طباعت مرتب کی خوش سلیقگی کا ثبوت ہے، لیکن کہیں کہیں اعراب کی غلطیاں ہیں اور مولانا کا ترجمہ قرآن پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے بعض جگہ قرآنی آیتوں کے ترجمہ کا حق ادا نہیں ہو سکا ہے، جیسے من نفس واحدۃ کا "ایک نفس واحد" سے یا تساءلون بہ کا "جس کے نام سے ایک دوسرے کے مطالبات حقوق کرتے ہو" (ص ۱۹) اور ص ۳ پر لتسکنوا الیہا الخ کا ترجمہ ترجمانی ہو گیا ہے،

تاریخ ادب عربی حصہ اول: مرتبہ مولانا مقتدیٰ حسن ازہری متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۲۴۴ قیمت درج نہیں پتے: (۱) مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس (۲) مکتبہ ترجمان ۱۴۱۲ پریس اسٹریٹ صدر بازار دہلی۔

اردو میں عربی شعر و ادب کے بارہ میں بہت کم لکھا گیا ہے، اس لئے لائق مصنف نے جن کو عربی زبان و ادب کا اچھا ذوق ہے، عربی ادب کی تاریخ کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کا پہلا حصہ ہے، جو آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے، اس میں جاہلی دور کے عربی شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، اس مقصد سے پہلے جزیرۂ عرب کی مختصر تاریخ، جغرافیائی حالات، جاہلیت کے مفہوم اور جاہلی دور کی تعیین کی گئی ہے، اور اس دور کے بعض اہم شہروں اور قبائل کے خصوصیات اور زمانہ جاہلیت کے اجتماعی، اقتصادی، دینی اور علمی حالات بیان کئے گئے ہیں، پھر عربی زبان کے مختلف لہجوں، اس کی اور دوسری سامی زبانوں کی خصوصیات کا ذکر ہے، مصنف نے جاہلی شاعری کی روایت و تدوین کے سلسلہ میں ان مستشرقین کی تردید کی ہے، جو اس کے پورے ذخیرہ کو الحاقی قرار دیتے ہیں، ایک فصل میں بعض شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے، آخر میں جاہلی دور کی نثر کے ضمن میں عربوں کے امثال و خطابت اور کاہنوں کے مسجع کلام پر بحث ہے، لیکن یہ حصہ بہت مختصر ہے، عربوں کی خطابت پر مزید کاوش سے لکھنے کی ضرورت تھی، اشخاص، قبائل اور مقامات پر توضیحی حواشی ہونے چاہئے تھے، پتہ نہیں مصنف کے انتخاب میں چار ہی جاہلی شاعر کیوں آسکے؟ یہ کتاب شعرائے نصرانیہ کے ذکر سے بھی خالی ہے، معلوم نہیں کتابت کی غلطی یا کسی اور سبب سے بعض اشعار کی نقل میں تصرف ہو گیا ہے، اس سے قطع نظر یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اس کی ترتیب میں مصر و شام کی جدید تالیفات کے علاوہ مستشرقین کی کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے، یہ کتاب اس حیثیت سے بھی مفید ہے، کہ یہ نہ بہت مختصر ہے اور نہ زیادہ مطول، جادۂ اعتدال:۔ مرتبہ پروفیسر عبد المغنی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت

وطباعت معمولی صفحات ۲۰۲ مجلد مع گرد پوش قیمت دس روپیے ناشر کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۔ ۴

پروفیسر عبدالمغنی نے وقتاً فوقتاً جو ادبی و تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں لکھے تھے ان کے بعض مجموعے پہلے چھپ چکے ہیں، ادب و نظر مجموعہ ۲۱ مضامین پر مشتمل ہے اس میں صف اول کے علاوہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے چند ادیبوں اور شاعروں کے خدمات شعر و ادب کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے، مصنف نے انیسؔ، غالبؔ، اقبالؔ، تلوک چند محروم فراق، فیض، عبدالعزیز خالد مانوس سہسرامی، پرویز شاہدی کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے، اور اختر اورینوی، علی عباس حسینی اور ش مظفرپوری کی افسانہ نگاری، رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری اور ملا ابن العرب کی طنز نگاری کی خصوصیات دکھائی ہیں، اور ان کے ادبی درجہ و مرتبہ کو واضح کیا ہے، مختلف اصناف مثلاً "جدید اردو شاعری" "ڈراما اور تھیٹر، اردو افسانہ نگاری اور اسلامی ادب پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے "جدید ادبی مسائل" "جدید و قدیم کا فریب" اور "اسلامی ادب" خصوصیت سے قابل مطالعہ مضامین ہیں، ان سے مصنف کے ادبی نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، وہ "ترقی پسند ادب" اور "جدیدیت" کے بڑے ناقد ہیں، دونوں کی انتہا پسندی، خامی بلکہ گمراہی بھی دکھائی ہے اور اسلامی ادب کے گرویدہ ہیں، اس کی خوبیوں اور توازن کا ذکر کیا ہے، انھوں نے فراق کی شاعری کے بارہ میں مناسب خیالات ظاہر کئے ہیں، مصنف کے بعض خیالات اور تبصروں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی ادبی و تنقیدی صلاحیت اچھی ہے، اور مجموعی حیثیت سے ان کے خیالات میں اعتدال و توازن ہے، اس لئے یہ مجموعہ مطالعہ کے لائق ہے،

"ض"

جلد ۱۲۲ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۸ء عدد ۵

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد